ہندوستان ہی میں گزرتا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب 'منٹو — مورلے ریفارم' پر عمل شروع کیا جارہا تھا۔ اور ان کا بہت وقت علی گڑھ کو ایک عظیم مسلم یونی ورسٹی بنانے کے منصوبے پر بھی صرف ہوتا تھا، برطانیہ جس کا سخت مخالف تھا۔ جب یہ ہدف حاصل ہو گیا تو آغا خان مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے لکھا ہے، ''اب، جب کہ سب کچھ ہو گیا ہے، اور میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی چالیس برس کی کارکردگی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں ہوں تو خیال آتا ہے کہ بلا شبہ میری زندگی کے بہت سے اہم کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے جو میرے لیے حقیقی طمانیت کا باعث ہے۔ اس مرکز کی تشکیل میں جو کردار میں نے ادا کیا ہے اپنی زندگی کے آخری دور میں اس کا احساس ہی میرے لیے خوشی اور تسکینِ قلب کا باعث ہوگا۔''

جب پہلی جنگِ عظیم چھڑی اتفاق سے اس وقت آغا خان افریقا میں تھے۔ وہ بڑی کوششوں سے جتنی جلد ہو سکا لندن پہنچے اور اپنی خدمات برطانوی حکومت کو پیش کر دیں جن کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔ اور مصر کے شاہی خاندان سے قریبی تعلقات کی وجہ سے درحقیقت انھوں نے برطانوی حکومت کے لیے کچھ بہت اہم کام کیے۔

جنگِ عظیم کے بعد آغا خان نے عوامی معاملات میں بہت کم حصہ لیا۔ مگر ۱۹۲۸ء کے آخر تک اس میں تبدیلی آئی اور اس لیے اس وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کی آل انڈیا مسلم لیگ کا دلّی میں اجلاس بلایا جائے تا کہ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں مسلمانوں کی کوئی محکم رائے قائم کی جائے۔ آغا خان کو اس اجلاس کی صدارت کے فرائض سونپے گئے۔ ''خاص طور پر اس کانفرنس کی یکجہتی بہت اہم تھی اس لیے کہ بہت دیر سے سہی مگر، اسی کے دوران بغیر کسی عوامی اعلان کے، مسٹر محمد علی جناح نے اپنے مسلم بھائیوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جناح صاحب نے کچھ عرصہ قبل ہی کلکتے میں منعقد ہونے والے آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ان کے لیے کانگریس میں، یا ایسے کسی بھی ادارے میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو، ملک گیر سطح پر، کوئی مستقبل نہیں تھا۔ آخرِ کار ہم نے ان کو اپنے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔''

اس کے بعد ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں آغا خان مسلمانوں کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے شریک ہوئے، ان کے لیے جو بڑے اعزاز کی بات تھی، اس لیے کہ اس وفد کے ارکان میں محمد علی جناح، سر محمد ظفر اللہ خاں، مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک، سر محمد شفیع جیسے لوگ شامل تھے۔ مہاتما گاندھی جو اس وقت تک ہندوستان کی کی تحریکِ آزادی کے روحانی رہنما ہو چکے تھے، پہلی کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے تھے مگر ۱۹۳۱ء میں ہونے والی کانفرنس میں، مشہور ہندوستانی شاعرہ سروجنی نائیڈو کی معیت میں کانگریس کے واحد مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

اس وقت تک، آغا خان کا رابطہ مہاتما گاندھی سے طویل عرصے رہ چکا تھا۔ اس لیے کہ دونوں ہی ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء سے جنوبی افریقا میں بسنے والے ہندوستانیوں کے مستقبل کے بارے میں عملی طور فکر مند رہتے تھے۔ اپنی یادداشتوں میں آغا خان نے مہاتما گاندھی کے فلسفیانہ نظریات کا بڑا دل چسپ اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے خیال میں انھی کی بنیاد پر مہاتما اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان اور اس کے باسیوں کے لیے نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنے عصر کی صنعتی اور مادّی تہذیب سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ ''ان کی زندگی میں داخل ہونے والے روحانی اثرات میں عہد نامۂ جدید کے مطابق (حضرت) عیسیٰ، ٹالسٹائے، اور ترکِ دنیا کے پرچارک Thoreau اور دوسرے ہندو اثرات گہرے تھے۔۔۔۔ مگر گاندھی کا فلسفہ ترکِ دنیا نہیں بلکہ اس دُنیا کی تجدید تھا۔''

صاف ظاہر ہے کہ آغا خان اور مسلمانوں کے وفد کے دوسرے لوگ گول میز کانفرنس کے دوسرے دور میں رہنما گاندھی کی شرکت سے بڑی توقعات لگائے ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کی با قاعدہ ابتدا سے قبل ہوٹل رِٹز میں، جہاں آغا خان ٹھہرے ہوئے تھے، مسٹر گاندھی اور مسز نائیڈو سے آدھی رات کے وقت ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کی تفصیل آغا خان نے یوں بیان کی ہے:

"پہلے کچھ وقت ہم نے تصویریں اتروانے کے لیے فوٹوگرافروں کے سامنے صرف کیا اور اس کے بعد بات چیت کے لیے جا بیٹھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے مہاتما جی سے کہا کہ اگر وہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے واقعی باپ جیسا کردار ادا کرنے پر تیار ہوں تو اس کے جواب میں وہ بھی ان کی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں بھرپور طریقے سے شرکت پر تیار ہوں گے۔

مہاتما جی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا، 'اگر سچ پوچھا جائے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے دل میں مسلمانوں کے لیے باپ جیسے محبت کے جذبات ہیں۔ مگر آپ کہتے ہیں تو میں سیاسی ضرورت کی بنا پر ہم دردی کے ساتھ اس پر گفتگو کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اور کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔'

مجھے ایسا لگا گویا مجھ پر ٹھنڈے پانی کا فوارہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس کے بعد پوری گفتگو کے دوران سرد مہری کا ماحول رہا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ مہاتما جی کے دل میں میرے بدیہی اور دل کی گہرائیوں سے اُٹھنے والے برادرانہ جذبے کا ویسا ہی ردِ عمل نہیں ہوا تھا۔"

یہ ملاقات اگر چہ سرسری سے کچھ زیادہ اثر پذیر ہوئی تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ثبوت اس بات کا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد صرف ایک سیاسی کیفیت کے مترادف تھا اور اس میں ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن کے احترام اور برادری جیسے کسی قسم کے جذبات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں دفن ہے اور میرا قاری ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ گفتگو، سنجیدہ مباحث، مگر بلا نتیجہ۔ ان سب نے آغا خان کو فٹز جیرالڈ کی نظم کے اس ٹکڑے کی یاد دلائی ہوگی۔

Myself when young did eagerly frequent
Doctor and Saint, and heard great argument
About it and about: but evermore
Came out by the same door as in I went.

تیسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ اُسی سال موسم بہار میں نام نہاد جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کا اجلاس لندن میں ہوا۔ گاندھی اور جناح نے اس میں شرکت نہیں کی۔ مگر اجلاس کے آخر میں ایک مشترکہ دستاویز جاری کی گئی جس میں ہند۔ برطانیہ تعلقات کی تاریخ میں پہلی بار تمام طبقوں کا ایک متفقہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا، جس میں زیرِ بحث تقریباً تمام سیاسی نکات شامل کیے گئے تھے۔ مگر کانگریس کے طبقۂ اعلیٰ نے اس کو رد کر دیا، حالاں کہ اس کے نمائندوں نے اس دستاویز پر دستخط کیے تھے۔

اس مشترکہ دستاویز اور اس کو جاری کرنے والی کمیٹی کے کام کے اختتام پر ہندوستانی سیاست سے آغا خان کے ذاتی روابط ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کام کے اعتبار سے سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں لیگ آف نیشنز میں کامیابی کے کئی سال گزرے، جہاں ان کے اہلِ خانہ نے دوسری جنگِ عظیم کے تکلیف دہ سال بھی گزارے۔

میں اس زمانے کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا چاہوں گا نہ ہی میں ان کی ذاتی زندگی، ان کی شادیوں، بین الاقوامی گھڑ دوڑ میں ان کی کامیابیوں اور اس نوع کی باتوں پر وقت صرف کروں گا۔ اگر چہ یہ سب اس شخصیت کے بارے میں ہے جسے صحیح معنوں میں ان چند اوّلین لوگوں میں شامل کیا جا سکتا ہے جو "عالمی قومیت" کے حامل تھے اور جس کا صرف نام ہی نہایت کشش کا حامل تھا۔ ایسا شخص جس کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کے تئیں پوری دنیا بھی حاضر تھی اور وافر وقت بھی، اگر وہ اپنے مقام کا پورا اور صحیح ادراک کر سکتا۔ میرے خیال میں مرحوم آغا خان اس میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ میرے نزدیک ان کو ہندوستانی حرّیت پسندوں کے اُس زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا جس میں مہاتما گاندھی، نہرو خاندان، محمد علی جناح، راجا صاحب محمود آباد، اصفہانی، علی برادران، گوکھلے، پٹیل اور دوسرے درجنوں افراد شامل تھے جنھوں نے عملی طور پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جد و جہد کی تھی۔ شاید یہ آغا خان کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر ان کا تقابل، ایک مخصوص و

محدود نقطۂ نظر سے بھی، ایسے لوگوں سے کیا جائے۔ آخر وہ برطانیہ کے شاہی حلقے کے ایک بلند رُتبہ رُکن تھے، ایک شہزادے کے مانند جس پر برطانیہ کی حکومت بہت اعتماد کرتی تھی، اور جو، ریاست حیدرآباد کے وزیرِ اعظم سر سالار جنگ کی طرح، کسی ایک محدود خطۂ ارض کے شہزادے نہیں تھے، جن کو گیارہ توپوں کی سلامی بھی دی گئی تھی۔ سر سالار جنگ کو اتنا بڑا اعزاز اس لیے بخشا گیا تھا کہ وہ تاجِ برطانیہ سے مرکزی ہندوستان اور دکن کی وفاداری کے ذمے دار تھے۔ اسی لیے برطانیہ کے اخبار ٹائمز نے اس رہنما کے بارے میں لکھا تھا کہ ''آغا خان پر سر سالار جنگ سے زیادہ وسیع ذمے داریاں تھیں اس لیے کہ انھوں نے مقامی اور صوبائی حدود سے کہیں زیادہ وسیع میدانوں میں خدمات انجام دی تھیں بالخصوص اس وقت جب برطانوی راج ۱۸۵۷ء کی اتھل پتھل سے زیادہ مشکل دور سے گزر رہا تھا۔

پھر بھی ہمیں جلد بازی میں غلط نتیجے نکالنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ تحریر ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی جب آغا خان کو مسلم لیگ کی صدارت سے فارغ ہوئے چار برس گزر چکے تھے اور ہندوستان کے سیاسی میدان میں ان کا دوبارہ داخلہ نہیں ہوا تھا۔ سیاسی حیثیت میں وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کے وفادار تھے، جب کہ ہندوستان کی ساری آبادی کے حقوق اور خودمختاری کی وکالت کرتے رہے۔ وہ جناح صاحب کی کامیابیوں کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے اس لیے کہ ہندوستان کے لوگوں اور دولتِ مشترکہ کے حکمرانوں کی ذہنیت کے پورے ادراک کے بغیر، جس میں ہندوستان بھی برابر کی سطح پر شریک ہونے والا تھا، یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی، تاجِ برطانیہ سے اپنے قریبی روابط اور اس کی سرکاری نمائندگی کی وجہ سے وہ (آغا خان) ایک مناسب 'ایجنٹ'، وزیرِ بے محکمہ یا جہاں گرد سفیر کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ اور اس تمام تر احترام اور اعتبار کے باوجود جو میں اس خاکے میں مذکور شخصیات کو دیتا ہوں، میرا خیال ہے کہ آغا خان نے ان کو سونپے گئے کردار کو حیرت خیز انداز میں انجام دیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اور آخر میں ایک اندرونِ خانہ بات۔ اپنے کردار کے سبب ہندوستان کی آبادی کے دل میں ان کی حیثیت کے لیے احترام کے باعث، ایسٹرن فیڈرل یونین کی سرپرستی ایک ایسا مثبت واقعہ تھا جس کے دور رس اثرات اس پاک ہند ادارے کے لیے بہت فائدہ مند ہوئے، اور اس ادارے نے جو مشکل اور قابلِ ذکر ہدف حاصل کیے ہیں، بلا شبہ ان جیسے انسان کی معیت کے بغیر ممکن نہ تھا۔

عبدالرحمٰن صدیقی (انداز اً ۱۹۴۰ء)

بنیاد کار

عبدالرحمن صدیقی

خوند کر فضلِ حیدر

اے آر صدیقی خلافت تحریک کے بعد

(۱۹۱۲ء/۱۹۱۳ء) میں ترکی جانے والا میڈیکل مشن (دائیں سے) شعیب قریشی، اے آر صدیقی اور چودھری خلیق الزماں

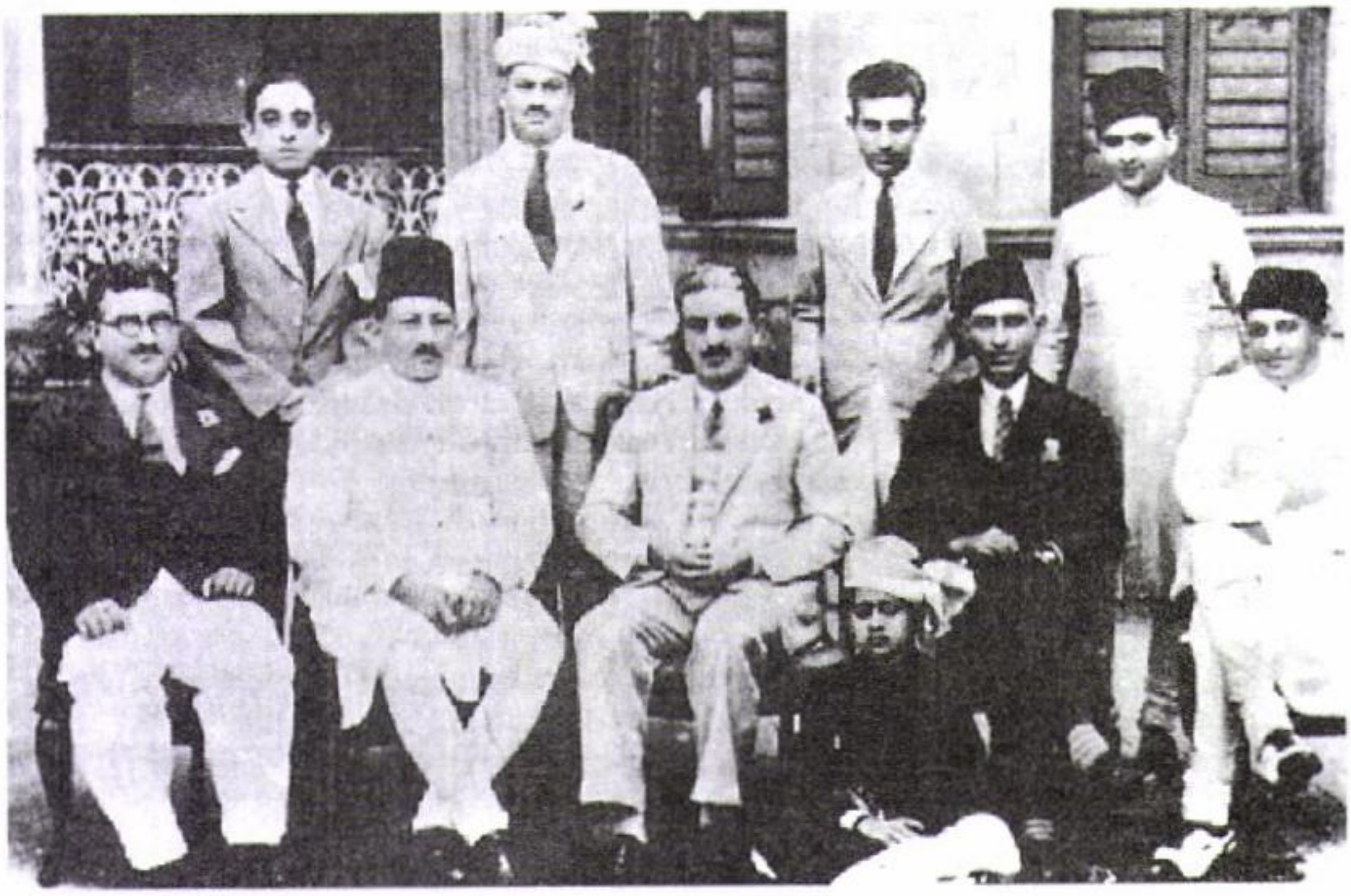

اے آر صدیقی کی جانب سے ترکی کی جنگ کے ہیرو رؤف بے کے اعزاز میں استقبالیہ، انتہائی بائیں جانب
کی نشست پر غلام محمد ہیں جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے

اے آر صدیقی کلکتہ میں ای ایف یو کے عملے کے ساتھ، ان کے دائیں جانب مسٹر اسپونر اور بائیں جانب عزیز انصاری ہیں

ترکی جانے والے خلافت تحریک کے میڈیکل مشن کے سربراہ کی جانب سے ترکی کی جنگ کے ہیرو رؤف بے
کے ہندوستان میں استقبالیہ کے موقع پر (دائیں سے بیٹھے ہوئے) ڈاکٹر انصاری، رؤف بے
اور دائیں طرف کھڑے ہوئے اے آر صدیقی

عبدالرحمن صدیقی

ایک نڈر، اور صاف گو مثالیت پسند

اس شخص نے اپنے لیے بہت سے عنوان تراش رکھے تھے: بین الاسلامی، وطن پرست، سیاست داں، تاجر، صحافی اور مقرر۔ عبدالرحمٰن صدیقی کی متحرک شخصیت فن کارانہ طور پر تراشے ہوئے کسی ہیرے کے بے شمار چمک دار پہلوؤں کا مجموعہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ صدی کے پہلے پچاس ہیجان خیز برسوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مادّی اور مالی طور پر بھلائی کرنے والوں میں کم ایسے ہوں گے جو اُن کی برابری کرسکیں گے۔ یقیناً وہ ایک عظیم الشان شخصیت تھے، زندگی کے ضمن میں ان کے بہت سے طے شدہ ہدف تھے اور خدا واندِ عالم نے ان کو متنوع خصوصیات سے نوازا تھا۔

عبدالرحمٰن صدیقی سورت کے متوسط طبقے کے ایک خاندان میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماموں سر علی محمد خاں دہلوی نے، جو ایک مشہور قانون داں تھے اور کراچی میں وکالت کرتے تھے، ان کی تعلیم کی نگہداشت کی۔ انھوں نے کراچی سے میٹرک کا امتحان دیا اور ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایم اے او کالج علی گڑھ گئے جہاں سے ۱۹۱۱ء میں انھوں نے تاریخ میں ایم اے کی ڈگری (اوّل بدرجہ اوّل حاصل کی۔

علی گڑھ میں گزرے ہوئے سال ان کے لیے فیصلہ کُن تھے جنھوں نے ان کی زندگی کے مستقبل کو سنوارا۔ اسی مشہور مسلم یونی ورسٹی میں ان کی ملاقاتیں ایسے بہت سے لوگوں سے ہوئیں جن کے اثرات ان کی ذاتی زندگی پر پڑے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا محمد علی تھے وہ جن کے زیرِ اثر آئے اور ان کے فلسفۂ مثالیت کے خوشہ چیں ہوئے۔ دوسرے شخص شعیب قریشی تھے جو ان کے ہمزاد جیسے قریبی دوست تھے۔ بہت سے لوگ جنھوں نے بعد میں شہرت حاصل کی ان میں سے اگر صرف چند کے نام لیے جائیں تو وہ خواجہ ناظم الدین، شہید سہروردی، عبدالرحمٰن پشاوری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر سید محمود تھے۔

علی گڑھ میں طالب علمی ہی کے زمانے میں وہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں رضا کار کے طور پر کام کرنے کے لیے ڈھاکے گئے تھے اور سچ پوچھا جائے تو یہی ان کی سیاسی زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔ وہ پیدائشی مقرر تھے اور اس صفت نے ان کو طالب علموں میں مقبول بنایا، ان کو طالب علموں کی یونین کا نائب صدر منتخب کرلیا گیا۔ یونین کا صدر ہمیشہ کالج کا پرنسپل ہی ہوتا تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ نائب صدر ہی کیمپس کی سب سے با اثر شخصیت ہوتی تھی۔ طالب علموں کے نمائندے کی حیثیت ملنے سے ان کو وہ مقام ملا جس نے ان کو برصغیر ہندوستان کے ممتاز رہبروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ گریجویشن کے بعد انھوں نے نواب وقار الملک کے معتمد کی حیثیت سے کام کیا، جو اس زمانے میں کالج کے معتمد تھے۔ نواب وقار الملک سرسیّد کے وفادار شاگردوں اور مسلم لیگ کے بنیاد گزاروں میں سے ایک تھے۔ اور یہی حیثیت تھی جس میں عبدالرحمٰن صدیقی (ARS) کو ملکی سیاست، ہندوستان کے مسلمان باشندوں اور علی گڑھ تحریک کے، جس کا مرکز

علی گڑھ ہی تھا، تجربات ہوئے۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ بہت اہم اور پُر آشوب تھا۔ مغربی تہذیب اور تمدّن کے اثرات نے ایک ایسا بارسوخ مگر آزاد خیال طبقہ پیدا کر دیا تھا جو یورپ کو اپنا عقلی و ذہنی گھر جانتا تھا۔ وہ اپنے تہذیبی نقوش کے بہت سے اجزا پر تنقید کرتا تھا۔ اس کے نزدیک ہندوستان اور یورپ کی تہذیبوں کے باہمی ملاپ کے ذریعے ہندوستانی زندگی کو جدید خطوط پر استوار کیا جانا ہی اس کا پسندیدہ معیار تھا۔ یورپی تہذیب کے بارے میں اس قسم کی بے باک اور بلا تنقید اور اس قسم کی نقالی نے ہندوستان میں ایک مخالف طبقہ بھی پیدا کر دیا جو ۱۸۷۰ء کے عشرے میں شروع ہو کر صدی کے آخری برسوں میں اپنے پورے کمال پر پہنچ گیا تھا۔ اس کو ہندو نشاۃِ الثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو دراصل قومیت اور ہندو مذہب کے ملاپ کا ایک نیا ظہور تھا۔ مسلمانوں کا ہندو مذہب کے اس احیا کا جواب سرسیّد احمد خاں اور ان کی علی گڑھ تحریک تھی۔ پاکستان کے سب سے نمایاں مورخ خالد بن سعید لکھتے ہیں کہ ''بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرف سے سرسید کو ان کی دلیری پر بہت خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اس لیے کہ انھوں نے ایسے زمانے میں اس نوع کے خیالات پیش کرنے کی جرأت کی جب ماحول کسی طرح بھی نہ آزاد خیال تھا اور نہ روادار۔ مگر جس بات پر زور نہیں دیا گیا وہ یہ حقیقت تھی کہ مذہب اور فکر کے ملاپ کی کوشش میں سرسیّد صرف مغربی تصورات ہی کے زیرِ اثر نہیں تھے۔ ان کا ذہن مغل تھا جو اپنے کمال پر بے تعصب بھی تھا اور انتخابی بھی۔ مغلوں نے وراثت میں صرف عالیشان تعمیرات ہی نہیں آزاد خیالی بھی چھوڑی ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایک سر برآوردہ برطانوی مؤرّخ نے لکھا تھا:

''سات برس کی تعلیم کے بعد ایک نوجوان مسلمان اپنے اس سر پر پگڑی باندھتا ہے جو ایسے خیالات سے مملو ہوتا ہے جو علم کی ان تین شاخوں سے متعلق ہوتے ہیں جیسے آکسفرڈ سے نکلنے والے تازہ دماغ میں ہوتے ہیں ۔ وہ سقراط و ارسطو، افلاطون و بقراط اور Galeen ابی سینا پر فر فر باتیں کر سکتا ہے۔''

اور میرے خیال میں یہ صرف ستائش ہی نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل دربار اور اعلیٰ تعلیم کے بارے میں اُن کی سمجھ بوجھ کو دور دراز تک احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور اس موضوع پر باتیں کرنے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اس وقت تک علی گڑھ صرف ایک تعلیمی شہر سے آگے نکل چکا تھا۔ یہ شہر اب مسلم تجدید اور شناخت کا مرکز بن چکا تھا۔

چودھری خلیق الزماں جو اسی برس پیدا ہوئے تھے جب ARS کی پیدائش ہوئی تھی، یعنی ۱۸۸۹ء میں اور انھوں نے بھی علی گڑھ ہی میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ بھی ایک سر برآوردہ مسلم رہبر بنے تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "Pathway to Pakistan" میں اس شہر کے بارے میں جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کتنا اہم تھا لکھا ہے:

''جغرافیائی اعتبار سے علی گڑھ ایک شہر کا نام ہے مگر مسلم سماج کی عام بول چال میں یہ لفظ تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی توقعات کی ایک نظریاتی علامت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ان کے ذہنوں میں یہ نام قرطبہ اور بغداد کی دُہائی کے طور پر اُبھرتا تھا۔ یہ شہر عمل کے ہر میدان میں مسلم نشاۃ الثانیہ کا مرکز تھا۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ جب کالج کی احاطے میں ہوتے تو طالب علم ہوتے مگر احاطے سے باہر ہر ایک ہندوستان میں مسلم سماج کے مستقبل کے لیے امید کا پیام بر ہوتا۔ علی گڑھ کا نام ایک طلسماتی کشش رکھتا تھا اور یہ ہر شہر ہر گاؤں کے مسلم گھرانے میں جانا جاتا تھا۔ جہاں بھی اس کے طلبہ گئے، ان کا استقبال احترام اور ستائش کے جذبات کے ساتھ کیا جاتا، بالخصوص دوسرے اداروں کے مسلم طلبہ میں۔ کالا کوٹ اور ترکی ٹوپی صرف کالج کے اوقات کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ وہ جب بھی اپنے گھروں سے باہر نکلتے تو یہی لباس زیبِ تن ہوتا تھا۔ ان میں خود اعتمادی ایسی ہوتی کہ بس دیکھتے رہیے، اس لیے کہ عوام کی پژمردہ روح کو بلند کرنا، ان میں امید اور خود اعتمادی کو بحال کرنا، ان کو ترقی اور پیش قدمی کی طرف راغب کرنا ان کی زندگی کا اوّلین مقصد ہوتا تھا۔ ہندوستان میں صدیوں کی ملوکیت

اور جاگیر داری نے اسلام کے غیر طبقاتی اور مساوات کے جذبے کو ماند کر دیا تھا۔ اس دور میں طبقات کے درمیان بلندی اور پستی کے تعصّبات، خاندانوں کے، قبیلہ جاتی برتری کے، فرقہ واریت کے احساسات نے مسلمانوں کو شیعہ اور سنّی، وہابی اور غیر وہابی، شافعی، حنفی، وغیرہ میں تقسیم کر کے رکھ دیا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے یہ عملی خیالات کے حامل سپاہی میدان عمل میں آ گئے تھے، نہ صرف تعصّبات اور تفرقوں کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جو زندگی کی سماجی اور علمی اقدار کو کھائے جا رہی تھیں بلکہ بھٹکے ہوئے گلّے کو باڑے میں واپس لانے کے لیے۔ یہ محض بلند نظریات کے پرچارک نہیں تھے، بلکہ وہ ان پر کالج کی اقامت گاہوں میں قیام کے دوران عمل بھی کرتے اور دوسروں کو ان پر چلنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔''

۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے اپنی آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی جو ۱۸۸۵ء میں بنائی جانے والی انڈیا کانگریس کا دیر آید جوابِ آں غزل' تھا۔ باوجود اس کے کہ کانگریس کے روحانی پیشوا تقسیم ہند کے وقت تک یہی ڈھول پیٹتے رہے کہ یہ ہندوستانیوں کی مشترکہ جماعت ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ خالصتاً ایک ہندو جماعت تھی۔ یہی وہ سنگم تھا جس پر پہنچ کر نوجوان ARS نے سیاست سے اپنی محبت کو دریافت کیا اور کم از کم غیر شعوری طور پر نہ صرف یہ کہ اس کو اپنا پیشہ بلکہ اپنا مقدر بنا لیا۔

ہندوستان سے باہر ہونے والے واقعات کے دھاروں نے بھی قومیت کے سیلاب کو تلاطم خیز کیا۔ اس وقت یورپ کی برتری کو للکارا نہیں گیا تھا۔ انیسویں سے بیسویں صدی کے موڑ پر ہونے والے کئی واقعات سے یہ اشارے ملے تھے کہ یہ بلا مقابلہ قیادت انحطاط پذیر ہو رہی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں اطالیہ کی فوج کو ابی سینیا میں افریقی جنگجوؤں کے بادشاہ مینیلک کے ہاتھوں شکستِ فاش ہو چکی تھی۔ اور چند برسوں بعد ہی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جنوبی افریقا میں بسے ہوئے ولندیزی کاشتکاروں نے برطانوی سامراج کے خلاف جنگ میں دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ اور سب سے زیادہ جاپان کے نیند سے اٹھ جانے سے ہندوستان کے قوم پرستوں کے انگ انگ میں بجلیاں بھر گئیں۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں دیکھا کہ اس چھوٹی سی ایشیائی طاقت نے روسی سلطنت کے مہیب ریچھ کو شکست دے دی۔ برطانیہ کے ایک ہم عصر نے اس زمانے میں ہندوستان میں پھیلتے ہوئے احساسات کو یوں بیان کیا ہے:

''ہندوستان کے شمالی علاقوں میں ایک ہیجانی جھرجھری دوڑ گئی تھی۔ دور دراز کے گاؤں کی چوپالوں میں راتوں کو بیٹھ کے حقہ کشی کرنے والے بھی جاپان کی فتوحات پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ طویل تجربے کے حامل ایک تُرک سفارت کار نے مجھے بتایا کہ 'اندورنِ ملک ہر جگہ جاہل سے جاہل کسان بھی ان خبروں سے جھنجھنا تا نظر آ رہا تھا۔' ایشیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل گیا تھا اور صدیوں کا خواب بالآخر ٹوٹ گیا تھا۔''

مسلمانوں میں خود اعتمادی کے نئے جنم کے ایسے جذباتی دور میں ARS کی ذہنی اور دانش ورانہ نشو و نما ہوئی تھی اور یہ بھی کہ انھوں نے علی برادران، شعیب قریشی، شہزادہ حمید اللہ خان، بھوپال کی تیسری بیگم، جو بعد میں تخت نشین ہوئیں، راجا محمود آباد، خلیق الزماں، ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھتیجے عزیر جیسے لوگوں سے زندگی بھر کی دوستیاں کیں۔ ARS کی حیات کا مطالعہ کرنے والوں کا ایسی بہت سی ہستیوں سے سامنا ہوتا ہے۔ یہ سب کے سب اپنے وقت کے منفرد و ممتاز شخصیتوں میں سے تھے اور یا تو جن کے سانچوں میں یہ خود ڈھل گئے تھے یا اُن کے لیے یہ مسلمانوں کے ایک نڈر ترجمان کی علامت بن گئے تھے۔

سیاست میں ان کی دل چسپیوں اور ان کے توانا اندازِ تحریر نے بہت جلد مولانا محمد علی کو ان کی جانب متوجہ کر لیا، جس سے ان کی پہلی ملاقات علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء کے جنوری میں ARS کو اپنے مشہور اخبار 'کامریڈ' میں مہتمم کی حیثیت سے شمولیت کی دعوت دی جس کا اجرا ایک سال قبل کلکتے سے ہو چکا تھا۔ یہ بڑے وسیع حلقے میں پڑھا جاتا تھا اور ہفتے وار اس کی اندازاً بیس ہزار کاپیاں شائع ہوتی تھیں۔ صحیح معنوں میں صرف ان اعداد و شمار سے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ کتنے قاری اس اخبار کے لکھے سے متاثر ہوتے تھے اس

لیے کہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے شہروں اور گاؤں کے اَن پڑھ باسیوں کے لیے اخبار با آوازِ بلند پڑھے جاتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے دربار میں بنگال کی تقسیم کا اعلان مسلمانوں کے مفادات کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔ اخبار 'کامریڈ' اور مولانا ابوالکلام آزاد کا ۱۹۱۲ء میں جاری کردہ اخبار 'الہلال' دونوں بڑھ چڑھ کر تمام دنیا کے مسلمانوں کو جگا رہے تھے۔ ان لوگوں کو اور بھی مشکلات درپیش تھیں۔ اطالیہ اور ترکی کے درمیان ہونے والی جنگ (۱۹۱۱ء) سے ان کو بہت مایوسی ہوئی اس لیے کہ ان کے نزدیک برطانیہ نے ترکوں کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ جنگِ بلقان (۱۹۱۲ء) نے تو مسلمانوں کی اور بھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسیحی طاقتوں کا طے شدہ منصوبہ تھا کہ ترکی کو یورپ سے نکال باہر کیا جائے تا کہ یورپ میں اس کی طاقت زائل ہو جائے۔ ان حالات کے زیرِ اثر 'ہلالِ احمر مشن' کے نام سے مسلم طبّی مشن ترکی بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا تا کہ طرابلس اور بلقان کی جنگ میں اس کی امداد کی جائے۔

ARS ان پُر جوش مسلم نوجوانوں میں سے تھے جن کو اس مشہور طبّی مشن میں شامل کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ تقریباً ایک برس بعد وہ ایم اے کرنے اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کلکتے سے علی گڑھ واپس پہنچے۔ مولانا محمد علی اپنے اخبار 'کامریڈ' کو کلکتے سے علی گڑھ منتقل کر چکے تھے اور ان (ARS) کے علی گڑھ پہنچے کے چند دن بعد ہی مولانا محمد علی نے مسلمانوں سے ایک فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل کی جو اس طبی مشن کے اخراجات اُٹھانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ دلّی کے ڈاکٹر انصاری جو لندن کے چیرنگ کراس ہسپتال کے ہاؤس سرجن رہ چکے تھے، اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ معالج تھے، اس مشن کے سربراہی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

چودھری خلیق الزماں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ "طلبہ کو طبی مشن بھیجنے کا خیال اچھا لگا اور ہم سب نے مشن فنڈ کے لیے چھوٹی چھوٹی رقمیں بھیجنا شروع کر دیا۔ ایک دن میں اپنے کمرے کے سامنے برہنہ پا اور برہنہ سر، بکھرے بالوں کے ساتھ ٹینس کھیلنے میں مصروف تھا کی رحمٰن نے مجھے پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا، جس کے پاس اعلیٰ درجے کے لباس میں ملبوس ایک وجیہ شخصیت کھڑی ہوئی تھی۔ رحمٰن نے اپنے کالج کی فٹ بال کی ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے طبی مشن لے جانے کی ذمے داری سنبھالنے پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ علی گڑھ اس لیے آئے ہیں کہ اپنی ذمے داریاں نبھانے میں معاونت کی خاطر کچھ نوجوانوں کو مدد کے لیے ساتھ لے جائیں۔ میں نے کہا کہ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ انتظامی امور سنبھالنے کے ساتھ مریضوں کی دیکھ بھال کی کچھ ذمے داریاں تو نبھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مجھے معاملات پر غور کرتا چھوڑ گئے۔ شام ہوتے تک میں نے طبی مشن میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چند دنوں بعد رحمٰن، شعیب قریشی، (ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے) عزیز انصاری، کالج سے میں اور اسکول سے منصور محمود اور عبدالرحمٰن پشاوری طبی مشن میں شمولیت کے لیے دلّی کے لیے روانہ ہو گئے، جہاں سے ہمیں بمبئی جانا تھا۔"

"مشن کی بمبئی روانگی سے قبل اس کے شرکاء کی ملاقات وائسرائے، لارڈ ہارڈنگ، سے کرائی گئی اور انھوں نے سب سے مصافحہ کیا۔ بمبئی سے طبی مشن ۶ نومبر ۱۹۱۲ء کو بذریعہ اطالوی بحری جہاز Sardinia روانہ ہو گیا۔ پانچ دن کے بحری سفر کے دوران ڈاکٹر انصاری نے ابتدائی طبی امداد پر کچھ لیکچر دیے۔ استنبول پہنچنے پر مشن کا ہلالِ احمر (Red Crescent) اور ترکی کی اہم شخصیات کی جانب سے پُرتپاک استقبال کیا گیا اور مشن نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ طبی مشن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور یہ دونوں میدانِ جنگ کے عقب میں اپنے ہسپتال قائم کرنے کے لیے استنبول سے روانہ ہو گئے۔ برف باری اور بارش کے درمیان دن رات زخمیوں کے استقبال کی تیاریوں اور ان کے معالجے کے سلسلے میں ان کے کام کو بہت سراہا گیا۔ ARS کو جنرل منیجر کی حیثیت سے استنبول ہی میں قیام کرنا تھا جہاں سے مشن کی ضروریات کی بجا آوری ان کا فریضہ تھا جس میں انھوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کو ثابت کر دیا اور ان کو ان کی صبر آزما اور دقت طلب کوششوں پر بہت داد دی گئی۔

مشن نے تین ماہ تک اپنے فرائض انجام دیے اور اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے، ایسے وقت میں جب اسلامی

قدریں اور بنیادی اُصول خطرے میں تھے، ایک کامیاب پیش رفت قرار دیا گیا تھا۔ اپنے عم کے بارے میں مجھ سے بات کرتے ہوئے بیگم قاضی نے، جو شعیب قریشی کی بیٹی اور ARS کے بھتیجے ڈاکٹر زیڈ کے قاضی کی اہلیہ تھیں، بتایا کہ ''لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے تھے کہ تحریکِ خلافت کے بانی صرف خلیفہ اور اس کے بدعنوان درباریوں کی جان بچانے کے لیے یہ تحریک چلا رہے تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں تھا۔ اور صرف خلیفہ اور اس کے درباریوں کی جان بچانے کے لیے اپنی جانوں پر نہیں کھیل رہے تھے۔ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ ترک سلطنت کی تباہی کے نتیجے میں مشرقِ وسطیٰ کے ٹکڑے ہو جائیں گے، مصنوعی طور پر ایسی نئی مملکتیں بنائی جائیں گی جن کا پہلے کبھی وجود بھی نہیں تھا اور یہ مملکتیں اطالوی، برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کے زیرِ تحفظ بن جائیں گی۔ دوسرے لفظوں میں، جیسا کہ میرے والد اور چچا ہمیشہ کہا کرتے تھے، تحریکِ بنیادی طور پر خلافت کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ اسلامی اُخوت کے لیے چلائی جا رہی تھی۔''

مشن کی تکمیل کے بعد اس کے زیادہ تر ارکان سیدھے ہندوستان واپس ہو گئے۔ روانگی سے قبل سلطان سے ان کا تعارف کرایا گیا جو لوگوں کی کارکردگی کا معترف تھا۔ ARS اور ان کے قریب ترین ساتھی، شعیب قریشی، چودھری خلیق الزماں اور عزیز انصاری نے ترکی ہی میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ لوگ ترکی اور اس کے لوگوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا قیام بلاشبہ لُطف انگیز رہا۔ ترکی سے واپسی پر ان کے دل و دماغ نئے تصورات اور خیالات سے پُر تھے اور یہ لوگ اسلامی برادری کے لیے اپنی جد و جہد جاری رکھنے کے لیے ہمہ تن تیار تھے۔ ہندوستان واپسی کے سفر کے دوران یہ لوگ مصر بھی گئے اور جب یہ سب اسکندریہ پہنچے تو 'رؤف بے' کی کمان میں ترکی کے مشہور بحریہ تباہ کُن جہاز 'حمیدیہ' کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جنگِ بلقان کے دوران کپتان رؤف بے کی کارگزاریوں کے بارے میں دوستوں نے سُن رکھا تھا کہ وہ نہایت فن کاری سے اپنے جہاز کو آبنائے Dardanelles سے نکال لایا تھا جب کہ اس علاقے پر یونانی جنگی جہازوں کے کڑے پہرے لگے ہوئے تھے۔ کھلے سمندر میں پہنچ جانے کے بعد اس نے یونانی بحریہ کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ان لوگوں نے جہاز پر جا کر رؤف بے' سے بھی ملاقات کی، جس کو زندگی سے بھرپور، توانائیوں اور مسکراہٹوں کی شخصیت پایا۔ ان لوگوں کی پسندیدگی یقیناً دوطرفہ رہی ہو گی اس لیے کہ اس وقت کی ایسی تصویروں میں ARS، خلیق الزماں قریشی اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ موجود تھے جب رؤف بے' ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔

علی گڑھ واپسی کے بعد سے سب دوستوں کا مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری سے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیالات کے سلسلے میں دلّی برابر آنا جانا رہتا تھا۔ عالمی جنگِ اوّل کی شروعات کے بعد مولانا محمد علی نے اپنے اخبار 'کامریڈ' میں The Choice of Turks کے عنوان سے مضمون شائع کیا جس میں انھوں نے ان وجوہات پر بحث کی کوشش کی تھی جن کی بنا پر ان کے خیال میں ترکوں کو جرمنوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا اگرچہ برطانیہ اس کو پسند نہیں کرتا۔ مضمون کی اشاعت کے بعد ان کا اخبار ضبط کر لیا گیا اور علی برادران کو قید کر دیا گیا اور وہ جنگ کے دوران پوری مدّت قید ہی میں رہے۔ برطانیہ کے بارے میں تلخیاں جب کہ ترکی کے مستقبل کے بارے میں فکر بڑھتی رہی حتیٰ یہ مرض ان مسلم لیگی لوگوں پر بھی اثر انداز ہونے لگا جو مغرب زدہ سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں بمبئی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں فضل الحق نے اعلان کیا تھا کہ ''میرے نزدیک ہندوستان میں اسلام کا مستقبل افسردگی اور تشویش کے گہرے سایوں کی زد میں لگتا ہے۔ ہر مسلم طاقت کے زوال کا واقعہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اہمیت پر نحس اثرات کا باعث ہوگا۔'' انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوؤں سے اپنی روایتی دشمنی کو ترک کر دیں اور برطانوی افسر شاہی کے خلاف ان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھائیں۔

اگرچہ یہ کچھ مستحسن نہیں تھا مگر اب یہ صاف نظر آنے لگا تھا کہ برطانیہ کی ترک مخالف پالیسی اور ہندوستان میں سرکاری جبر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بازوؤں میں ڈھکیل رہا تھا۔ اس کا پہلا اشارہ ۱۹۱۶ء میں ہونے والا مشہور 'لکھنؤ معاہدہ' تھا جس کے اہم تریں معمار محمد علی جناح تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے روشن خیال بازو کی سربراہی سنبھال لی تھی اور اور اب وہ ہندو۔ مسلم اتحاد کے سفیر کے طور پر

نے جاتے تھے۔ یہ معاہدہ دونوں جانب سے دی جانے والی رعایات کا ماحصل تھا۔ اور اسی جذبے کے تحت مہاتھا گاندھی آگے آئے اور خود
ریکِ خلافت کا حصہ بن گئے۔ اور جہاں لکھنؤ معاہدے سے ظاہر ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے درمیانہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اپنے
ہبی اختلافات بھلا کر قریب آسکتے ہیں وہیں تحریکِ خلافت سے یہ بھی اظہر من الشمس ہوا کہ اگر سیاست اور اس کی عوامی تحریکاتِ میں مذہبی
ناصر شامل کیے گئے تو بہت ہی مختصر عرصے میں آپس کے سمجھوتے کی فضا ہوا ہو جائے گی۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس مخصوص واقعے کے
زیے سے اس دور کے کے تاریخ دان یہی کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاید گاندھی نے محسوس کر لیا تھا کہ اس تحریک کی
ایت سے نہ صرف وہ برطانوی استعمار پر کاری ضرب لگا سکیں گے بلکہ وہ یہ بھی اچھی طرح واضح کر دیں گے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے
میان کی خلیج کو پاٹنا کتنا ضروری ہے اور اس قسم کی باتوں سے وہ مسلمانوں کو مسلم لیگ سے دور کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔
سلمانوں کے خاص الخاص معاملے میں گاندھی کی یہ دخل اندازی ایک انوکھا عمل تھا۔ اور مولانا محمد علی جیسے تنقیدی ذہن نے بھی مہاتما کو
احبِ کشف اور 'بڑے دل کا آدمی' کہا اور اُن کے گن گانے پر مجبور ہو گیا۔ صرف علی گڑھ نے مہاتما کی ترغیبات سے صرفِ نظر کیا اور اپنے
راز میں لڑتا رہا۔ مگر وہ ترک ہی تھے جنھوں نے تحریکِ خلافت کو ختم کر دیا، نہ تو یورپی ہی کچھ کر سکے نہ ہی گاندھی کی نافرمانی کی پالیسی اثر
راز ہوئی۔ مصطفیٰ کمال اتا تُرک کے اقتدار پر قبضے نے سلطنتِ عثمانیہ کو درہم برہم کر دیا اور ترکی ایک جدید جمہوریہ بن کر ابھرا۔ لہٰذا
صطفیٰ کمال نے خلافت کو از کار رفتہ ادارہ سمجھ کر ختم کر دیا۔ ہندوستان کے مسلمان ایک گہرے تذبذب میں غرق ہو گئے۔ اس طرح جہاں
روانتہا پسندی کو ایسی توانائی مل گئی جیسی پہلے کبھی نہ تھی، وہیں مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ہندوستان کی مسلمان آبادی کو سُرعت سے
لتے ہوئے ہندوستان میں اپنے مستقبل کے لیے اپنی کارکردگی کا تجزیہ کرنا پڑا۔

ترکی سے واپسی کے بعد ARS نے تحریکِ خلافت میں عملی طور پر بھرپور حصہ لیا تھا۔ اپنے دوستوں، قریشی اور خلیق الزمان کے ساتھ
وں نے اسلحے اور گولہ بارود کے حصول کی غرض سے سرحدی علاقوں کے دورے بھی کئے تھے، اس لیے وہ سمجھ رہے تھے کہ جنگ میں ترکوں اور
سنوں کی امداد ان کی اپنی جد و جہد، یعنی اپنی آزادی، میں معاون ہوگی۔ انھوں نے افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان تک کو ترکی کی حمایت
ے لیے راضی کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب لاہور کے بہت سے مسلم طلبہ کالج چھوڑ کر انتشار اور بدنظمی کے مارے شمال مغربی
حدی علاقے میں داخل ہو گئے تھے جہاں وہ انتہا پرست قبائل کے ساتھ ہو لیے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف جہاد کرنے پر تُلے
ئے تھے۔ تاریخ کی کتابوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کی کوششیں ناکام ہونے والی تھیں۔ اپنی تمام تر مشکلات اور خطرات کے باوجود
پنے لوگوں کو غیر جانب دار رکھا اور اپنا سارا زور سرحد کو پُرسکون رکھنے پر صرف کر دیا تھا۔ خلیق الزماں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اپنے
ستوں کی مہم جوئیوں کا بہت صاف نقشہ کھینچا ہے۔ اپنی اور اپنے قریبی دوستوں کی دلیرانہ کارروائیوں کے بارے میں، جو نہ صرف اپنے مستقبل
راپنی جانوں پر کھیل کر جو کچھ کر گزرنا چاہتے تھے، اس کے بارے میں یہ ایک عمدہ تحریری یادگار کے مماثل ہے۔

اس دوران ARS نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں قانون پڑھنے کے لیے داخلہ لے لیا تھا اور امتیاز کے ساتھ LL.B کر لیا تھا۔
بھی ان کی سیاسی اور عوامی سرگرمیاں جاری رہیں اور کچھ دنوں کے لیے وہ کانگریس کے فعال کارکن بھی رہے مگر بالآخر جب محمد علی جناح
اس میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم لیگ ہی وہ جگہ ہے جہاں ان کو ہونا چاہیے۔ تمام عمر ان کی محبتیں اور
رمیاں عالمی اسلامی مسائل کے لیے وقف رہیں۔ ان کے گرو اور باپ کے مماثل، محمد علی، کے عقائد ہمیشہ ان کے عقائد رہے۔ قید سے
ئی کے بعد محمد علی ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت میں ۱۹۱۹ء میں برطانیہ گئے تا کہ برطانوی حکومت کو بتائیں کہ مسلمان کبھی پیغمبرِ اسلام کے
ام سے روگردانی نہیں کر سکتے، جنھوں نے بسترِ مرگ پر ہونے کے باوجود مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا کہ جزیرہ نمائے عرب (عرب، عراق، شام
لسطین) کو کسی غیر اسلامی طاقت کے ہاتھ نہ جانے دیا جائے۔ یہی ARS کا بھی ایمان تھا اور اپنے طویل سیاسی کردار میں انھوں نے اس

کو اپنا مطمحِ نظر بنائے رکھا تھا۔ انھوں نے بہت سے بین الاقوامی اجتماعات میں مسلمانوں کی نمائندگی کی اور لندن کے دفترِ خارجہ میں منعقد ہونے والی اسکاربرا (Scarborough) کمیٹی میں مسلم لیگ کی نمائندگی کی، جو ۱۹۲۱ء میں ہندوستان سُدھار کے لیے بنائی جانے والی مشہور Montague-Chelmsford Scheme for Reforms in India کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اور یہی وہ وقت بھی تھا جب علی برادران، شعیب قریشی، اور خلیق الزماں نے مل کر قسم کھائی تھی کہ وہ کبھی شادی نہیں کریں گے اور صرف اپنے پیارے ملک کی خدمت میں زندگی گزار دیں گے۔ بیگم قاضی کہتی ہیں کہ ''ان کی جانب سے یہ ایک بہت سوچا سمجھا اقدام تھا، ورنہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس ملک کی خدمت کرنے کے لیے کافی وقت نہ ہوگا۔'' ان کے دو دوستوں نے بعد میں اپنا ارادہ تبدیل کر دیا مگر ARS اپنے عہد پر اٹل رہے اور تجرد کی زندگی گزار دی۔ اور وہ لوگ جو ان سے اچھی طرح واقف تھے بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کی پاسداری کی حالاں کہ بعد کے برسوں میں ان میں وہ تمام خصوصیتیں (چڑچڑا پن وغیرہ) پیدا ہوگئی تھیں جنھوں نے ان کو ایک 'دل آویز سن رسیدہ کنواری عورت' جیسا مرد بنا دیا تھا۔

انگلستان میں اپنے قیام کے دوران ARS نے آکسفرڈ کے Wadham College میں قانون کی تعلیم کے لیے داخلہ لے لیا اور ۱۹۲۲ء میں بیرسٹر بن گئے۔ انھوں نے کچھ سیاسی مصروفیتوں کی بنا پر آکسفرڈ میں مزید اعلیٰ تعلیم کے مواقع چھوڑ دیے۔ ان میں سے ایک مصروفیت خلافت کمیٹی کے چیف ایجنٹ کی تھی جس کی رہنمائی مولانا محمد علی کر رہے تھے۔ لندن کے قیام کے دوران رفتہ رفتہ زندگی کے بارے میں ان کا زاویۂ نظر تبدیل ہوتا رہا۔ ان کے ذہن میں پُرانے دوستوں کی مرکزیت تو تھی ہی مگر اس دوران انھوں نے کچھ نئی دوستیاں بھی قائم کیں، ان کے ذہن میں نئے خیالات بھی ابھرے اور انھوں نے تازہ تصورات بھی اخذ کیے۔ سر حمید اللہ خان جیسے لوگ، جو بعد میں نواب بھوپال بنے، اور ان کے دوستوں کے مرکزی کردار کے الیف حیدر وغیرہ نے ان کے زرخیز ذہن کی آبیاری کی۔ غلام محمد بھی، جو بعد میں پاکستان کی گورنر جنرل بنے، ان کے حلقۂ دوستان کے ایک فرد تھے اس لیے کہ وہ حیدر سے بہت قربت رکھتے تھے۔ غلام محمد عمر میں سب سے چھوٹے تھے اس لیے ARS ان کے روز مرّہ پر نظر بھی رکھتے تھے۔ حیدر مشہورِ زمانہ Lincoln's Inn میں قانون پڑھ رہے تھے جہاں سے ۲۵ برس قبل محمد علی جناح فارغ تحصیل ہوئے تھے اور اعزاز کے طور پر اس کے ہال کمرے اور گیلری کے صدر دروازے کے اوپر کی سنگی دیوار پر ان کی تصویر آویزاں ہے۔ یہ ایک مختصر سا گروہ تھا جس میں اکثر ملک سے آنے والے کچھ لوگ بھی شامل ہو جاتے۔ حیدر جو بیکر اسٹریٹ پر ایک فلیٹ میں مقیم تھے، کھانا پکانے کے شوقین تھے۔ اس طرح سب دوست دوپہر کے کھانے پر ملاقات کرتے اور حیدر ان سب کے لیے مزے مزے کے ہندوستانی کھانے تیار کرتے۔ کہتے ہیں کہ کرکٹ اور برِج کے علاوہ یہ لوگ ہر وقت مسلم سیاست پر باتیں کرتے تھے۔ ARS کی طرح ان میں سے بہت سے علی گڑھ سے پڑھے ہوئے تھے جن میں شعیب قریشی، غلام محمد اور شہزادہ حمید اللہ خان شامل تھے۔ ان کے مرغوب موضوعات میں سے ایک ہندوستان کے تجارتی اور تعلیمی میدانوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی پس ماندگی ہوتی تھی۔ ہندوستان کے زیادہ تر صنعتی اور تجارتی حلقے انگریزوں یا ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھے۔ بیگم قاضی کہتی ہیں کہ یہ ولولہ انگیز اور روشن خیال نوجوان لوگ ایک طرح سے لندن کے مشہور ادارے Lloyds Syndicate کے مماثل تھے۔ ''اگرچہ یہ سب ہمیشہ ہم خیال نہیں ہوتے تھے اور کچھ تو سیاسی اختلافات بھی رکھتے تھے، وہ بار بار کہتے تھے، سیاسی اختلاف اپنی جگہ مگر ہم سب پہلے دوست ہیں بعد میں کچھ اور۔ ہم ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔''

غالباً ۱۹۲۵ء میں ARS اور حیدر نے ایک ساتھ کاروبار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے کاروباری قسمت آزمائی کے لیے Haira Limited نام کا ایک مشترکہ ادارہ ترتیب دیا۔ اس نام میں 'Hai' حیدر سے لیا گیا تھا اور 'ra' رحمٰن صدیقی کے نام سے۔ یہ درآمد و برآمد میں اچھا خاصا کام کر لیتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب پہلی بار کے الیف حیدر کی مالیاتی ہنرمندی دریافت ہوئی۔ ARS ان کے

جیسے ساتھی پا کر خوش تھے اس لیے حیدر کی موجودگی میں ان کو سیاسی مصروفیتوں پر توجہ دینے کے لیے خاصا وقت مل جایا کرتا۔ اسی دوران ARS اور کے ایف حیدر کی ملاقات Clive Collin نامی ایک شخص سے ہوگئی جو لندن کے ایک Lloyds Brokers ادارے کے شراکت دار کا بیٹا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ARS کی ملاقات اس کے والد BM Collins سے استنبول میں ہو چکی تھی جب وہ اپنی سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں وہاں گئے ہوئے تھے۔ ARS کے نزدیک وہ نہ صرف ایک معتبر شخص تھے بلکہ کاروبار کے معاملے میں مہم جو بھی واقع ہوئے تھے۔ یہ کولنز ہی تھے جنھوں نے ان دونوں کو ہندوستان میں بیمہ کمپنی کھولنے کا خیال پیش کیا۔ ان لوگوں کے سیاسی پس منظر اور فعّال دوستوں کے ممکنہ تعاون کے پیشِ نظر یہ خیال زرخیز زمیں میں ایک بیج کے مماثل ٹھہرا۔ دوستوں کے درمیان سنجیدہ اور گرما گرم مباحث جاری رہی جس میں شہزادہ حمید اللہ اور غلام محمد بھی شامل ہوتے۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ مسلمانوں کی ملکیت اور مسلمان کارکنوں پر منحصر بیمہ کمپنی ایک اچھی شروعات ہوگی جس سے اس کے شرکا اور مسلم عوام کو فائدہ ہوگا۔ لہٰذا اس مشورے کو صدقِ دل سے قبول کر لیا گیا اور دی اٹلس انشورنس کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کی مدد بھی حاصل کر لی گئی جنھوں نے کمپنی کی شروعات میں انتظامی امور پر مشاورت اور امداد کے وعدے کیے۔ صدی کے تیسرے عشرے میں ضروری کارروائی مکمل کر لی گئی۔ اس وقت تک شہزادہ حمید اللہ خان نے، جو بھوپال کے نواب بن چکے تھے، اور آغا خان دونوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کی سرپرستی قبول کر لی۔ کمپنی کلکتے میں رجسٹر کرائی گئی اور اس کے صدر دفاتر واقع ۹ کلائیو اسٹریٹ، کلکتے میں ۲؍ستمبر ۱۹۳۲ء میں پہلی بار کھولے گئے۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے پہلے چیئرمین ARS بنائے گئے اور لندن کی کمپنی اٹلس سے ای این مینی نک نام کے ایک افسر جنرل منیجر مقرر کیے گئے۔ نواب بھوپال اور آغا خان کی خاصی بڑی مالی معاونت کے باوجود کمپنی کے حصص کو عوام میں فروخت کرنا تھا جو ایک بہت مشکل کام تھا۔

جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کے ہڈیوں کے سرجن پروفیسر قاضی نے بتایا کہ ''جب ہمارے چچا اور ان کے ساتھیوں نے ایسٹرن فیڈرل نام کی کمپنی قائم کی تو ہم لوگوں کو اس کے حصص فروخت کرنے پر مامور کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے اپنے اسکول کے پرنسپل پر حصص تھوپنے کی کوشش کی تھی جب کہ میری والدہ اپنے کلب میں حصص خواتین میں فروخت کرتی تھیں۔ میرے چچا نے ہم لوگوں کے لیے بھی شاید پانچ پانچ حصص خریدے تھے۔ کم عمری کی وجہ سے اس وقت مجھ میں اس کاروبار کو سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ مگر جب ہم بڑے ہوئے تو ہمیں پتہ چلا کہ ایسٹرن فیڈرل اور میرے چچا کا نام ایک دوسرے کے مترادف تھے اور ہم نے خود بمبئی شہر میں اس کی شاخ کو کھلتے دیکھا تھا۔''

وہ زمانہ دیوہیکل برطانوی کمپنیوں کا تھا جب وہ ہندوستان کی مارکٹ پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان میں کئی غیر مسلم ہندوستانی کمپنیاں بھی تھیں جن کے قبضے میں کاروبار کا معتد بہ حصہ تھا۔ ان کے مقابلے میں EFU کا اپنے کاروبار کو قائم کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں اور تقسیمِ ہند سے قبل ہی اس کو ایک معیاری کمپنی ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ کمپنی کی ساکھ کی بنیادی وجہ ان لوگوں کی وجہ سے تھی جو اس سے منسلک تھے جنھوں نے علی گڑھ تعلیم اور ترکی جانے والے طبّی مشن اور لندن جانے والے وفد میں شرکت کی وجہ سے اعتبار پایا تھا۔ اور کچھ وہ تھے جنھوں نے ۱۹۲۰ء میں اس ادارے میں شرکت کی تھی جو درآمد اور برآمدی تجارت کی غرض سے دی یونائیٹڈ ڈیولپمنٹ کمپنی کے نام سے لکھنؤ میں قائم ہوئی تھی اور ۱۹۲۱ء میں کلکتے منتقل کر دی گئی تھی۔ اس میں پانچ حصے دار تھے: شعیب قریشی، چودھری خلیق الزماں، ترکی جانے والے مشہور طبی مشن کے سربراہ ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھتیجے عزیز انصاری۔ کچھ دنوں بعد کے ایف حیدر نے ان سے مل کر لندن میں ایک ادارہ قائم کیا تھا۔

عزیز انصاری جو علی گڑھ میں تعلیم کے دوران سرسیّد ہال میں ان کے کالج کے اقامتی ساتھی تھے، یوپی کے شہر بارہ بنکی میں وکالت کرتے تھے۔ ان کو بعد میں نواب رام پور نے جج کے عہدے پر فائز کیا اور وہ وہیں بس رہے۔ مگر ۱۹۳۰ء میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کلکتے گئے جہاں ۱۹۳۲ء میں وہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے ڈائریکٹر بنا دیے گئے۔ اس وقت کمپنی میں ARS کے سب سے معتمد ساتھی وہی تھے اور

اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ ARS اپنی گوں ناگوں سیاسی اور کاروباری مصروفیات کی وجہ سے کلکتے سے باہر ہوتے۔ اور یہ غیر حاضریاں بڑھتی ہی گئیں۔ اس وقت تک ARS مسلم لیگ کے اندرونی حلقے کے ایک سینئر رُکن بن چکے تھے، اتنے کہ محمد علی جناح نے ان کو ۱۹۳۶ء میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کا رُکن نامزد کر دیا تھا۔ اس کے بائیس ارکان میں سے آٹھ بنگال سے تھے۔ ان میں نواب ڈھاکا، حسین شہید سہروردی، فضل الحق، ابوالحسن اصفہانی، اور ان کے بڑے بھائی مرزا احمد اور مجیب الرحمٰن شامل تھے۔ یو پی سے جناح نے سات افراد کو چُنا تھا ان میں لیاقت علی خان، راجا صاحب محمود آباد، مولانا شوکت علی اور خلیق الزمان شامل تھے۔ ہم اس جگمگ کرتے ہوئے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو وہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے مسلم حصے کے "Who's Who" معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر سربرآوردہ شخصیات ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کی ایگزیکٹیو کاونسل کی رُکن بھی بنائی گئیں۔ ARS ان میں سے ایک تھے اور اسی سال انھوں نے کلکتے سے انتخاب لڑا اور اس جیسے بڑے شہر کے لارڈ میئر منتخب ہوئے۔

گویا اتنا کچھ ایک آدمی کے لیے کافی نہ تھا، ARS نے ۱۹۴۰ء میں ''مارننگ نیوز'' کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔ اس وجہ سے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے عزیز انصاری کو EFU کا ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بنا دیا تا کہ ARS کو کچھ سہولت مہیا ہو۔ عزیز انصاری اس عہدے پر رہے تا آنکہ ۱۹۴۶ء میں حکومتِ ہندوستان نے ان کو کنٹرولر آف انشورنس بنا دیا۔

اتنی ساری تہہ در تہہ ذمے داریوں اور مصروفیتوں کے باوجود ARS 'اپنی' EFU کے لیے کافی وقت نکالتے رہے۔ وہ ۱۹۵۰ء تک نہایت فعّال چیئرمین رہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہ عہدہ اصفہانی گروپ کے سربراہ مرزا احمد اصفہانی کے لیے خالی کر دیا، جو اس وقت EFU کے سب سے بڑے حصص دار تھا۔

جب بھی وہ کلکتے میں ہوتے پورا دن اپنے دفتر میں گزارتے۔ محمد چودھری نے، جو پاکستان کے سب سے کامیاب بیمہ سربراہوں میں سے ایک ہیں اور اپنا بیمے کا پیشہ انھوں نے اسی کمپنی سے شروع کیا تھا، ARS کی بہت سی عادتوں اور خصوصیتوں کے بارے دل چسپ باتیں بتائیں۔ چودھری، جن کو میں اپنی ملازمت کے دنوں سے جانتا ہوں، یکم ستمبر ۱۹۴۷ء میں، پاکستان کی تخلیق سے چند دن قبل، ای ایف یو میں ملازم ہوئے تھے اور اس وقت تک اس میں رہے جب کمپنی کا دفتر کلکتے سے کراچی منتقل ہو رہا تھا۔ چودھری کہتے ہیں کہ ''عبدالرحمٰن صدیقی اس وقت چیئرمین تھے۔ وہ میرے دادا عبدالمتین چودھری کے قریبی دوست تھے جو اس وقت مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل اور مسٹر جناح کے قریبی ساتھی تھے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں صدیقی صاحب سے جا کر ملوں۔ مجھ جیسا کم عمر اور زیرِ تربیت ملازم عمومی طور پر چیئرمین سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ میرے لیے یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے دادا کے نام کے حوالے سے ان کے سیکریٹری سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ صدیقی صاحب نے دوسرے دن صبح کے وقت مجھے میکلوڈ اسٹریٹ کے دفتر میں، جو گوروں کے قبرستان کے ساتھ ہی تھا، مجھے طلب کیا جس پر میں بہت خوش تھا۔ یہ دفتر ایک تین منزلہ انگریزی طرز کا ٹاؤن ہاؤس تھا۔ اس میں ایک لفٹ موجود تھی جس کے ذریعے مجھے تیسری منزل پر جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ میں وہاں گیا اور میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے صدیقی صاحب کو کمرے کے دروازے پر اپنا انتظار کرتے پایا، شاید دربان نے ٹیلی فون کے ذریعے ان کو میری متوقع آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے دفتر کے دروازے ہی پر خوش آمدید کہا جو میرے لیے بے حد غیر متوقع بات تھی۔ بہر حال وہ مجھے ملاقات کے کمرے میں لے گئے جہاں ایک میز پر ناشتے کے تمام لوازم چُنے ہوئے تھے۔ میں نے ناشتا کیا اور اپنے دادا کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ انھوں نے میری ہمت افزائی کی اور کمپنی میں دیے جانے والے نئے فرائض پر نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ختم ہو گئی۔

اس کے بعد بھی ان سے میری مڈبھیڑ ہوتی رہی اس لیے کہ وہ دفتر آنے کے معاملے میں بہت پابند تھے۔ وہ ٹھیک نو بجے دفتر پہنچ جاتے۔ دن کا بیشتر وقت دفتر میں گزارتے، غالباً دوپہر کے کھانے کے وقت تک یا اکثر اس کے بعد تک۔ وہ لفٹ میں کم ہی نظر آتے تھے۔

زیادہ تر سیڑھیاں استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ اپنے دفتر کے اہلکاروں کے لیے وہ ایک بڑا مسئلہ تھے۔ مثال کے طور پر دفتر کا دربان مشکل ہی سے ان کو پہلے سلام کر پاتا، اس لیے اس کے ہاتھ اُٹھانے سے قبل ہی چیئرمین اس کو سلام کر لیتے۔ یہ ان کی خصوصیت تھی۔

وہ بہت خوش وضع اور باسلیقہ شخصیت کے مالک تھے۔ ہمیشہ سپید شروانی زیبِ تن کرتے تھے اور ان کے سر پر ہمیشہ ترکی ٹوپی Fez ہوتی تھی۔ آنکھوں پر بہت موٹے فریم کا چشمہ پہنتے تھے۔ ایک اور بات جوان کے منصب کے لحاظ سے بہت اہم تھی، جس کے بارے میں تمام کام کرنے والے بات کرتے تھے، کہ وہ ہمیشہ عام دفتر والوں کا غسل خانہ استعمال کرتے تھے، افسروں کے لیے مخصوص غسل خانہ انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔''

جب محمد چودھری EFU میں ملازم ہوئے اس وقت کمپنی کے دفاتر کلائیو روڈ سے ڈلہوزی اسکوائر منتقل ہو گئے تھے۔ ایک نفیس اور اعلیٰ درجے کی عمارت میں جس کا نام اسٹینڈرڈ بلڈنگ تھا جو اسی نام کی ایک بڑی انشورنس کمپنی کی ملکیت تھی۔ اسی عمارت میں برطانیہ کی بڑی کمپنیوں میں سے ایک کمرشل یونین کے دفاتر بھی تھے جو کچھ برس بعد کراچی، پاکستان کے قمر ہاؤس میں (جواب EFU House بن چکا ہے) ایک بار پھر پڑوسی بن گئے۔

یہ عمارت اب بھی موجود اور خاصی اچھی حالت میں ہے۔ آج کل اس میں ویسٹ بنگال واٹر اتھارٹیز کا دفتر ہے جو ایک حکومتی ادارہ ہے۔ اس کا اندرون کم و بیش ویسا ہی ہے۔ لفٹ کام نہیں کرتی، بڑے ہال کمروں میں پنکھے لگے ہوئے، پہلی منزل پر خوبصورت ماہوگنی لکڑی کے تختوں سے مزیّن دیواروں والا بڑا کمرہ جو اب منیجر کا کمرہ ہے، یقیناً ان دنوں چیئرمین کی حیثیت میں ARS کا دفتر رہا ہوگا وہاں بھی وہ، جیسا کہ ہم نے سنا ہے، ٹھیک نو بجے دفتر پہنچتے رہے ہوں گے۔ میں اور میری اہلیہ EFU کے شاندار ماضی کی کھوج میں ۱۹۹۸ء میں وہاں گئے تھے۔ اس میں بیٹھنے والے منیجر نے ہماری چائے سے تواضع کی اور جب اس کو بتایا گیا کہ اس کمرے میں، جو آج اس کا دفتر ہے، کس قسم کے لوگ بیٹھتے اور بات کرتے رہے ہوں گے تو وہ سن کر پھڑک اُٹھا تھا۔ اور جب ہم اس سے رخصت ہوئے تو اس کے چہرے پر سرور پھیلا ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس دن اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ اہم سمجھتا رہا ہوگا۔

میں بھی جذباتی ہو رہا تھا۔ کھلے ہوئے وسیع و عریض دفتر سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھی محمد حنیف، جو EFU میں میری تقرری کے دوران مشرقی پاکستان کے شہر کُھلنا میں برانچ منیجر تھے، بہت یاد آئے۔ انھوں نے ۱۹۸۲ء میں کمپنی کی گولڈن جوبلی کے موقعے پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

''رحمٰن صاحب EFU کے نچلے درجے کے ملازمین کے لیے بہت ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ جب بھی ہال کمرے سے گزرتے تو کسی ٹائپسٹ یا کلرک کی میز کے قریب رُکتے، یا کسی چپراسی کی طرف بڑھ کر ان کے احوال دریافت کرتے۔ میں نے ان کو بذاتِ خود جھک کر فرش پر گری ہوئی pins اور gem clips اٹھا کر قریبی میز پر رکھتے دیکھا ہے۔ وہ حقیقتاً دفتر کے کارکنوں سے محبت کرتے تھے، خاص کر وہ جو نچلے درجے میں ہوتے تھے۔ میں ایک مسٹر اللہ رکھا کی مثال دینا چاہوں گا جو ہمارے دفتر میں چپراسی تھے۔ انھوں نے عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کو مشرقی پاکستان کے گورنر کے عہدے پر فائز ہونے کے سلسلے میں مبارک باد کا خط لکھا تھا۔

خط ملنے پر خوشی سے وہ اتنے مغلوب ہوئے کہ انھوں نے اپنے ADC کو حکم دیا کہ وہ کلکتے میں ہوائی جہاز کے منیجر سے کہیں کہ اللہ رکھا کے لیے فوراً ڈھاکے سفر کرنے کے لیے ٹکٹ جاری کریں اور مہمان کی حیثیت سے ان کے ڈھاکا آنے کے لیے انتظامات کیے جائیں۔ جس دن اللہ رکھا آنے والے تھے صدیقی صاحب بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس کی راہداری میں تیز تیز قدموں چلتے ہوئے اللہ رکھا کا انتظار کر رہے تھے اور جوں ہی اللہ رکھا آئے ان کی طرف تیزی سے بڑھے اور بڑی گرم جوشی سے ان کو گلے سے لگا لیا۔

ڈھاکے میں گورنری کے دوران وہ EFU کے دفتر سے رابطے میں رہتے اور ہمارے برانچ منیجر مسٹر شمس الحق کو برابر فون کرتے

رہتے، کبھی کبھی تو دن میں کئی بار۔ کبھی کبھی وہ دفتر بھی تشریف لاتے تھے۔''

اگر چہ وہ بہت درشت اور صاف گو انسان تھے، دل کے بہت اچھے رہے ہوں گے۔ ان کے بھانجے پروفیسر قاضی کہتے ہیں ک
ماموں جان، جس نام سے وہ خاندان میں پکارے جاتے تھے، اپنی دو بہنوں پر غضب ناک رہتے۔ سب سے چھوٹے ہونے کے باوجود
سب پر حاوی رہتے تھے۔ کم سنی کے زمانے میں ہم بھانجوں کے لیے وہ دہشت ہوتے تھے۔ اس کے بعد وہ ایسے دوست بن گئے ہم جس
عزت کرتے تھے۔ ماموں جان نے تعلیم کے دوران بھی اور بعد میں ملازمت کے سلسلے میں ہم لوگوں کی اکثر مدد کی۔ خاص طور پر میں ا
سے بہت فیضیاب ہوا تھا۔ میں جب انگلستان میں تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھا تو وہ میرے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ جب میں واپس آ
تھا تو انھوں نے آلاتِ جراحی خریدنے میں بھی میری مالی معاونت کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ''اپنے اوزار کے بغیر حجام کسی کام کا نہیں ہوتا۔'' میر
شادی کے سلسلے میں ان کی پوری رضامندی شامل تھی اس لیے کہ ان کے قریب ترین ساتھی مرحوم شعیب قریشی کی لڑکی سے ہو رہی تھی۔ شعیب
تو تقریباً ان کے ہمزاد جیسے تھے۔ جب میں نے کمانا شروع کیا تو میں نے ماموں جان سے کہا کہ میں وہ روپے واپس کرنا چاہتا ہوں جو انھوں
نے انگلستان میں میرے تعلیم پر خرچ کیے تھے۔ وہ بولے، ''ضرور دو میرے بیٹے مگر اسی طرح جیسے میں نے اپنے قرض چکائے ہیں۔ میر
ماموں نے مجھے پڑھایا، میں نے تم کو پڑھایا۔ لہٰذا اب تم دوسروں کو تعلیم دلواؤ۔''

پہلے جن دو لڑکوں کی تعلیم کے لیے انھوں نے سفارش کی وہ ہمارے کلب میں ٹینس کورٹ میں گیندیں اُٹھانے پر مامور تھے۔ چوں
کہ وہ اسکول نہیں جا سکتے تھے، ان کو گھر پر تعلیم دلوائی گئی۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ کلکتے کی کچی آبادیوں سے لڑکے ڈھونڈ کر لاتے اور ان کی
تعلیم کا بندوبست کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے ایک نے ایم ایس سی کر لیا تھا اور ڈاکٹریٹ کرنے کی تیاری میں تھا۔ وہ ایک
چوکی دار کا بیٹا تھا۔ دو اور لڑکے، انھوں نے جن کی مدد کی تھی، اب آنکھوں کے سرجن بن چکے ہیں۔ وہ طبّی پیشے کے لیے بہت ہم دردی کے
جذبات رکھتے تھے۔ شاید طبّی پیشے کی طرف ان کا جھکاؤ ڈاکٹر انصاری سے ان کے پرانے روابط اور ترکی جانے والے طبی مشن کے سلسلے میں
ان کے تجربات کی بنا پر تھا۔ اتنی ساری انسانی خصوصیات کے باوجود وہ بہت سخت آدمی تھے۔''

وہ بہت صاف گو اور بے حد راست باز انسان تھے۔ ان کے بھانجے کے مطابق، ''وہ سفارت کار کبھی نہیں بن سکتے تھے۔ سچ تو یہ
ہے کہ ان سے بڑھ کر غیر موقع شناس کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بار مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں سفارتی فرائض کے لیے ان کے بارے میں
غور بھی کیا جا رہا تھا۔ مسلم دنیا کے بیشتر اہم رہنماؤں سے بہت قریبی اور ذاتی تعلقات اور ترکی و فلسطین میں ان کی خدمات کے پیشِ نظر بلا شبہ
وہ ایک اچھے سفیر ثابت ہوتے۔ مگر خطرہ اس بات کا رہتا تھا کہ اگر ان کو سفیر بنا دیا گیا تو وہ مشرقِ وسطیٰ جنگ کی ابتدا کرا دیں گے۔''

مجھے خبر نہیں کہ یہ بات کہاں تک درست ہے مگر جس انداز میں وہ گفتگو کرتے، اور لکھتے تھے، یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت
تیز و تند زبان استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ بیگم قاضی نے ایک دل چسپ اور مزے دار قصہ سنایا جو قارئین کو ضرور پسند آئے گا۔

آپ کو معلوم ہے کی ہمارے ماموں جان کلکتے کے میئر بنے اور کافی دنوں تک اس عہدے پر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ
ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا یہ عیدِ میلاد النبی کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔ اور مولانا جوٹا نے اس موقعے پر بڑی دھواں دار تقریر کی۔ انھوں نے امہات
المومنین کے حمل کے بارے میں بیان کرنا شروع کیا کہ نو ماہ تک بچہ رحمِ مادر میں رہا وغیرہ وغیرہ۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکے تو ہمارے
ماموں نے جو اس وقت میئر تھے، ان کی طرف پلٹے اور پوچھا کہ مولانا کیا آپ کے لڑکیاں بھی ہیں۔ مولانا نے فرمایا جی ہاں خدا کے فضل سے
۔ ماموں نے کہا ''اچھا تو پھر جب ان میں سے کوئی بچہ جنم دینے کے قریب ہو تو مجھ کو بلا لیجئے گا۔ مولانا بہت جز بز ہوئے اور انھوں نے
عبدالرحمٰن صدیقی کی بدتہذیبی کی سختی سے شکایت کی۔ انھوں نے مولانا کی سرزنش کرتے ہوئے کہ اس سے بڑی تو مولانا کی بدتہذیبی تھی کہ وہ
ہمارے نبی کے خانگی معاملات کے بارے میں ہزراوں افراد کے سامنے باتیں کر رہے تھے حالاں کہ ان کو کچھ اور موضوعات پر تقریر کرنی

پاہیے تھی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا صاحب حق بجانب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ماموں بہت زیادہ صاف گو تھے لکہ کبھی کبھی بدتہذیب بھی ہو جاتے تھے، اس لیے بہت سے لوگ ان کے درشت لہجے کی وجہ سے انھیں پسند نہیں کرتے تھے حالاں کہ بیشتر گ، حتیٰ کہ ان کے ناقد بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اس واقعے پر جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے شاید وہ صحیح تھے۔ مگر سیاسی اعتبار سے تنے لوگوں کی موجودگی میں انہیں علی الاعلان اس طرح مولانا کی خبر نہیں لینی چاہیے تھے۔ جی ہاں ماموں بہت سے اعزازات ملنے کے عث کچھ بددماغ ہو گئے تھے۔ مگر وہ ایسے انسان تھے جو کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔

وہ بہت تنہا انسان تھے۔ اور حالاں کہ وہ لوگوں سے ملتے جلتے تھے، محفلوں میں جاتے اور خود بھی محفلیں سجاتے تھے مگر کبھی کبھی اور چانک وہ جارحانہ انداز میں سنگ دل ہو جاتے اور لوگوں کی خبر لینے لگتے، بلا وجہ۔ مختلف لوگوں سے ARS کے بارے میں قصے سننے کے بعد ں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ افسردہ اور غم زدہ ہو جاتے ہوں گے۔ میرے خیال میں اس انسان نے اپنے اوپر اتنے فرائض لاد لیے تھے اور ن سب کی ادائیگی ان کے بس سے باہر ہو جاتی رہی ہوگی جو شاید اُن جیسے 'سوپر ہیومن' کے لیے بھی مشکل تھی۔

بیگم قاضی کہتی ہیں کہ "اکثر ہمارے ماموں جان لوگوں سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اور ہم کبھی کبھی سوچتے کہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر ہمیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ ایک رات ان کے ایک بہت عزیز دوست نے ان کو کھانے کی دعوت دی تھی۔ اور وہ مجھے پنے ساتھ لے گئے، ایسا وہ اس وقت کیا کرتے تھے جب مدعوئین کی بیویاں بھی مدعو ہوتی تھیں۔ اور اچانک ان کی نظر ایک شخص پر پڑی، میں ن کا نام اب بھول چکی ہوں، اور ذرا اونچی آواز میں انھوں نے اپنے میزبان سے کہا، 'تم نے اس احمق کو کیوں بلایا ہے۔ یہاں یہ رہے گا یا یں۔ تمھیں اس جیسے لوگوں کو نہیں بلانا چاہیے۔ اور اس کے بعد وہ دعوت چھوڑ کر چلے گئے۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں رُکنا چاہتی ہوں یا نہیں شاید اس لیے کہ اس شخص سے میرا کوئی سروکار نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں، میں بھلا کیسے رُک سکتی تھی۔ میں بھی ن کے ساتھ واپس ہو گئی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر شخص ایسی باتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔"

مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ بالکل مختلف آدمی بھی ہو جاتے تھے۔ دوست دار، خوش، پُرکشش اور ہمہ وقت حاضر۔ کبھی وہ بہت ملنسار ور دوستوں عزیزوں سے رابطہ رکھنے والے بھی نظر آتے تھے۔ اور وہ جب اچھے موڈ میں ہوتے تو گنگناتے اور گاتے ہوئے بھی سنے جاتے تھے۔ امریکہ اور یورپ کی پرانی فلموں کے عوام میں مقبول گانے، لوک دھنیں وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ وہ منقسم شخصیت رکھتے تھے مگر اپنے رائض سے انھوں نے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ مسلمانوں سے متعلق سیاسی مسائل سے ان کی دل بستگی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ غیر مسلم بھی ان کی یمان داری اور ان کے ذاتی کردار کے حوالے سے ان کی عزت کرتے تھے۔ جن سے انہیں اختلاف ہوتا ان سے بھی بہت صفائی اور حقیقت سندانہ انداز میں پیش آتے۔ انھوں نے کبھی اپنے مخالفین پر بھی اوچھے وار نہیں کئے۔ پروفیسر قاضی نے مجھے بتایا کہ ایک بار، جب وہ فلسطین کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے، ان کے اخبار مارننگ نیوز میں مہاتما گاندھی کے بارے کچھ رکیک الفاظ شائع کر دیے گئے تھے۔ ھوں نے ایڈیٹر کی اچھی طرح خبر لی اس لیے کہ وہ اپنے اخبار کو ذاتیات سے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور انھوں نے کبھی اس قسم کے الفاظ کسی کے لیے استعمال نہیں کئے تھے۔ بیگم قاضی کہتی ہیں کہ "صحافتی معاملات میں بھی وہ اپنے متعین کردہ اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ وہ میشہ سچ بولنے اور سچ لکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کی صحافی کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ آپ خبر لکھ رہے ہیں تو وہ خبر ہی ہونی چاہیے۔ س میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہونے چاہیے۔ ایک صحافی کو ہر موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو کبھی کبھی ایک خاموش بصر کا کردار بھی ادا کرنا چاہیے۔ وہ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔"

میرے خیال میں ہندوستان کی آزادی کے تاریخ نویسوں نے ARS کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ صرف ہما شما ہی نہیں تھے جن کے بارے جو جی چاہے لکھ دیا جاتا۔ وہ ایک اہم شخصیت تھے اور اپنی، اچھی یا بُری، کارگزاریوں کی بنا پر صرف پسند ہی نہیں کئے جاتے تھے،

لوگ ان سے انسیت بھی رکھتے تھے۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلم تحریک اور مسلمانوں کی معاشی نشاۃِ الثانیہ کے معاملے میں ندرتِ خیال سے کام لیتے تھے۔ قائدِ اعظم کے قریبی رفیقِ کار جناب ابوالحسن اصفہانی نے، مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں خود جن کوششوں کو خاطر خوہ پذیرائی نہیں ہوئی ہے، اپنی کتاب میں جس کا عنوان تھا ''قائدِ اعظم جناح جیسا میں نے انھیں دیکھا'' میں ARS ان کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آزادی سے قبل کے بنگال میں مسلمانوں کی آبادی سوا تین کروڑ کے لگ بھگ تھی جو ہندوستان کی سیاست میں خاصی اہمیت حامل تھی۔ پاکستان کی تخلیق میں کامیابی پر بنگال کے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی کامیابی بہت اہم تھی۔ بنگال کے بارے میں بات کرتے ہو میرے نزدیک یہ بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے قریبی ساتھیوں عبدالرحمٰن صدیقی اور خواجہ ناظم الدین کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے بنگا میں مسلم لیگ کو خود پسند اور موقع پرست نام نہاد لیڈروں سے نجات دلائی اور اس کو ایک اہم ادارے میں تبدیل کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۳۲ سے قبل، جب تک میں محمد علی جناح کا معتقد نہیں بنا تھا، عبدالرحمٰن میرے سیاسی گرو تھے۔ اس زمانے میں نورالدین، عبدالرحمٰن اور میں The Three Tailors of Tooley Street' کے نام سے جانے جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو ہم کو The Three Musketeers' کہا جاتا تھا۔ ہم اپنے مخالفین کے لیے انگریزی محاورے کے مطابق ان کے ''پہلو میں کانٹے'' کے مصداق تھے اور ہ نے ہمیشہ اپنے فرائض بغیر کسی خوف کے انجام دیتے تھے۔''

اور وہ واقعی نڈر تھے، اپنی تقریروں میں بھی۔ انھوں نے اپنی سیاسی اور کاروباری زندگی کے دوران بے شمار تقریریں کی تھیں مگر ا میں سے بہت کم ہی محفوظ رہ سکیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ان کی کئی تقریریں مل گئی جو ان کے بھانجے اور بھانجی کے پاس محفوظ تھیں ان میں سے ایک تقریر تو وہ تھی جو دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر انھوں نے آل انڈیا انڈونیشیا کانفرنس، منعقدہ لاہور ۱۹ رجنوری ۱۹۴۵ء میں صدر کی حیثیت سے کی تھی۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے انہوں نے اپنی تقریر میں بہت سخت زبان استعمال کی تھی۔ اس تقریر کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ان کی شعلہ بیانی خود ظاہر ہو جائے گی:

''ہمیں بتایا گیا تھا کہ جنگ آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑی گئی ہے۔ اب ہم عالمی تناظر میں خود اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا جن اعلیٰ مقاصد کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں بھی یا نہیں جو انسانیت کی تقدیر کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ فاتحین نے دنیا کو اتنا ہی مخدوش بنا دیا ہے جتنا کہ ان کے متکبر اور فساد انگیز اذہان بنا سکتے تھے۔ انسانیت کی قابلِ تحسین اور اعلیٰ اقدار کو سیاسی ریشہ دوانیوں، تجارتی رقابتوں، حسد، بے اعتباری ایک دوسرے کے درمیان یقین کے فقدان، وسیع و عریض دنیا میں بسنے والے عوام الناس پر حکم چلانے، کمزور اور خوف زدہ کو دھمکانے سے بدل دیا گیا ہے، ان لوگوں کے طفیل جو ایک قیامتِ صغریٰ کے کھنڈرات سے اور بھی طاقتور ہو کر ابھرے ہیں۔ ایک بھوکی اور تباہ حال دنیا پر خود غرضی اور بے شرمی کا، را پھر سے نافذ ہو گیا ہے۔ کمزور اور مفلس کو اب اپنے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی لے کر قطار میں ان کے دروازے پر کھڑے ہو کے بھیک اور چھوٹی چھوٹی مہربانیوں کا منتظر ہونا پڑ رہا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک قسم کے آمروں کی جگہ اب دوسری قسم کے آمروں نے لے لی ہے۔

جنگیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر جب ایک جنگ ختم ہوتی ہے تو اپنے عقب میں تباہیوں اور تلخیوں کا ایک ہُو نبالۂ گرد چھوڑ جاتی ہے جو اس وقت تک چھایا رہتا ہے جب تک کہ دوسری جنگ چھڑ نہیں جاتی۔ ابھی ہم ۱۹۱۴ء کی تباہ کاریوں سے بہ مشکل نکل پائے تھے کہ ۱۹۳۹ کے ایسے شعلوں میں جھونک دیے گئے ہیں جو غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کے ناٹک کے باوجود اب بھی بھڑک رہے ہیں۔ تلوار ابھی ہل نہیں بنی ہے امن ابھی نہیں ہوا ہے۔''

پنانگ (Penang) میں ہندوستان اور ملایا کے مسلمانوں کی کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں کی گئی صدارتی تقریر میں فلسطین

کے موضوع پر ان کے سیاسی عقائد کی ایک اور روشن مثال ملتی ہے:

''اسرائیل کی سلطنتِ موعودہ، کوئی آزاد مملکت نہیں، زیادہ سے زیادہ ایک تحفظ شدہ طفیلی ریاست ہوگی۔ اس کو ایک عیسائی اتالیق ی ضرورت ہوگی۔ یہودیوں کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اپنے ہم نسل عرب برادران سے بنا کر رکھیں جن کو اگر ٹھنڈا اور پُرسکون نہیں کیا گیا تو اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اپنے وطن کے ٹکڑے ہونے اور اپنی زمین کو قبضے میں جانے سے بچانے پر تُل جائیں گے۔

ہم (مسلمان) نفیس ترین اور حقیقی معنوں میں بین الاقومیت کے پیروکار ہیں اور چودہ سو برس پہلے آنے والے اپنے عظیم رہبر کی علیمات کی روشنی میں، یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، نسل، رنگ اور ملک ہمارے اندازِ زندگی پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ روگردان ہوئے وں اور راہِ راست سے بھٹک گئے ہوں مگر اس کا پیغام، شفاف بلّور کی مانند آج بھی اُسی طرح دمک رہا ہے جیسا کہ اس دن تھا جب یہ پہلی ر ہم تک پہنچایا گیا تھا۔

مغرب کی پیدا کردہ قومیت انسانیت کے لیے ایک بد دعا ہے۔ کیا ہمیں اس کی تاراجی کی مثالیں دیکھنے کے لیے بہت دور تک جانا ے گا؟ دونوں جنگیں اور سامراجیت کی پوری تاریخ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں جس نے انسانیت کو 'میری قوم، اچھی ہو یا بُری' ی لعنت کے ذریعے اس قعرِ مذلّت تک پہنچایا ہے۔ اس نے انسان کی برادری کے تصور ہی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس نے ہم میں حسد اور قابتوں کو جنم دیا ہے جواب بھی ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ ہمارے کے لیے فساد اور تباہی کا باعث ہوں گے۔''

عبدالرحمٰن ایک نڈر انسان تھا۔ وہ اپنے معیار اور اپنے تصورات کے لیے لڑتا رہا۔ اور یہ کچھ اس نے اپنی آنکھیں کُھلی رکھتے ہوئے لیا۔ ضرورت کے وقت وہ شدید وار سے نہیں چوکتا تھا مگر اس نے کبھی اوچھا وار نہیں کیا۔ جب اس پوچھا گیا کہ اس نے اپنی پچاس برس کی گامہ خیز زندگی کے باوجود اپنی سوانح حیات کیوں نہیں لکھی تو اس نے جواب دیا، ''میں حقیقتوں کو چٹ پٹی زبان میں چھپا کر بیان نہیں کر سکتا۔ ر اگر میں نے کبھی وہ کچھ لکھ دیا جو میں لکھنا چاہتا ہوں تو ایمپریس مارکیٹ (کے مذبح) میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں گے''

دوسروں کے مقابلے میں، جن میں ان کے قریبی دوست بھی شامل ہیں، انھوں نے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا۔ اور جب عملی طور پر ھوں نے ایسٹرن فیڈرل کی بنیاد رکھی تو اس لیے نہیں کہ اپنی انا کو آسودہ کرنا یا ایک بڑے مالیاتی ادارے کے چیئرمین بننا چاہتے تھے۔ اپنے ریبی دوستوں کے ساتھ مل کر انھوں نے اس ادارے کی بنیاد اس لیے ڈالی کہ ان کو یقین تھا کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی خدمت ہوگی وران کی مالیاتی نشاۃِ الثانیہ کے سلسلے میں یہ عمل ان کی ذاتی امداد کے مماثل ہوگا۔ اپنے اخبار 'مارننگ نیوز' میں ایک بار انھوں نے لکھا تھا، ''پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی زراعت کو، صنعتوں کو، تجارت اور عام مالیاتی اداروں کو مستحکم کرنا ہوگا۔ ہم میں سے جو لوگ اس تعمیر کے عمل میں ہاتھ بٹائیں گے وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہوں گے۔''

اپنا فرض ادا کرنا ان کا ایمان تھا۔ ان کے بھتیجے پروفیسر قاضی کہتے ہیں کہ ''ان کے اُصول ان کے اپنے بنائے ہوئے تھے، اگرچہ ن میں سے بیشتر اخلاقیات کے اعتبار سے صحیح ہوتے تھے۔ خراب انگریزی ان کو کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی خواہ تحریری ہو یا تقریری۔ کم از کم یرے خیال میں وہ ایک گرج دار مقرر تھے اور ان کے لکھے ہوئے بیشتر خطوط بڑی روانیِ تحریر کے مظہر تھے، ہمیشہ صاف ستھرے اور بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے۔ ڈھاکا میں اپنی گورنری کے دوران جب وہ علیل ہوگئے تو ان کے لکھے ہوئے خطوط میں ہجّے اور قواعد کی غلطیاں ہوتی تھیں۔ ہمیں فوراً احساس ہوگیا کہ ان کا دماغ اب ان کے قابو میں نہیں۔ شعیب قریشی (پروفیسر قاضی کے خسر جو اس وقت ہندوستان میں ہائی کمشنر کے رُتبے پر فائز تھے) پریشان ہوگئے تھے، انھوں نے کہا کہ رحمٰن غلطی نہیں کرتا، یقیناً وہ ضرور بیمار ہے۔

میرے چچا چالیس برس کی عمر سے ذیابیطس کے مریض تھے۔ ان دنوں اس مرض کا صرف یہی علاج تھا کہ انسولین کے انجکشن لیے ائیں اور غذا پر سخت پابندیاں ہوں۔ وہ انجکشن تو لیتے تھے مگر پرہیز کے معاملے میں وہ کسی کی نہیں سنتے تھے۔ ہر نقصان دہ شے ان کو دل سے

مرغوب تھی۔ آم کے موسم میں کھانے کے وقت ایک درجن آم کھانا ان کا معمول تھا۔ بالآخران کو اپنی بد پرہیزیوں کا قرض چکانا پڑا۔ ان کے خون میں ہمیشہ شکر کی بہتات رہتی مگر اس کے باوجود جب ۱۹۵۲ء میں وہ مشرقی پاکستان کے گورنر بنے تو ٹھیک ٹھاک تھے۔ مگر چھ ماہ بعد وہ ہمارے فلیٹ پر نیم فالج زدہ اور ذہنی طور پر ابتر کیفیت میں پہنچائے گئے۔''

پروفیسر قاضی نے ان کو جناح ہسپتال کے خاص الخاص وارڈ میں داخل کرادیا تھا۔ اوران کے قریبی دوست غلام محمد، جو اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل تھے اور کے ایف حیدر برابر ان کی مزاج پرسی کے لیے آتے رہتے تھے۔ بیگم قاضی نے بتایا کہ ''انھوں نے کافی امداد کی۔ وہ جب آتے تو سہارا دے کران کو بستر سے اُٹھاتے اور چلاتے اس لیے کہ ان کی ٹانگیں پوری طرح کام نہیں کر رہی تھیں۔ یہ بہت دردانگیز منظر تھا۔ میرے خیال میں وہ ذہنی طور پر بہت مضطرب اور پراگندہ تھے۔ پراگندہ اس لیے کہ تقسیمِ ہند کے بعد لوگ ویسے نہیں رہ گئے تھے جیسے کہ تحریکِ آزادی کے دوران تھے۔ لوگوں کے دل و دماغ میں تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اکثر وہ اس بات کا شکوہ کرتے اور رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اقدار تبدیل ہوگئی تھیں۔ دولت سب سے اہم شے ہوگئی تھی۔ جب بھی وہ اخبار پڑھتے تو جو کچھ لکھا ہوتا اس پر کبیدہ خاطر ہو جاتے۔''

اپنے قریب ترین دوست شعیب قریشی سے جن کو وہ اپنا بھائی سمجھتے تھے اور جو دلّی سے ان کی عیادت کو آئے تھے، ان کو کہتے سنا گیا تھا کہ ''ہمارے اطراف جھوٹ اور جھوٹوں کی بہتات ہوگئی ہے۔''

بالآخر ایک طویل علالت کے بعد انھوں نے ۲۶ رمئی ۱۹۵۳ء کو انتقال کیا اور پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

۱۹۶۰ء کراچی بوٹ کلب میں کے ایف حیدر کو دی گئی الوداعی تقریب میں ایس ایم معین الدین گفتگو کرتے ہوئے، تصویر میں امین خراسانی، ڈبلیو ڈبلیو کرنوسکی، خدا بخش، ایم وصال الدین اور ایس سی سبجالی بھی نمایاں ہیں

کے ایف حیدر گورنر جنرل غلام محمد کے ساتھ سعودی عرب کے دورے پر

کے ایف حیدر احباب کے ساتھ کھانے کی میز پر

کے ایف حیدر صنعت کاروں اور کاروباری شخصیات کے ساتھ ملاقات کے موقع پر
ان کے بائیں طرف احمد داؤد ہیں

خوند کر فضلِ حیدر

بھوپال سے ہمارے ساتھی

یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس وقت نوجوان تھا، ابھی میری عمر تیس برس بھی نہیں تھی۔ جب میں نے ایک غیر ملک میں نئی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے اپنا ملک چھوڑا تو ہر نوجوان کی طرح میں متردّد بھی تھا اور متجسس بھی۔ ایک بالکل ہی نئی دنیا مجھے للکار رہی تھی۔ کئی برسوں سے جنگ کے بعد کے جرمنی کو چھوڑنا چاہ رہا تھا، اگرچہ وہاں کے حالات ٹھیک ہو چکے تھے۔ میں ان پرانے چاولوں میں سے تھا جن کو جنگ کے اختتام اور اس کی تباہ کاریوں کے بعد نئی پیشہ ورانہ ذمے داریاں اور ترقی کے نئے مواقع مل رہے تھے، اگرچہ عمر اور تجربے کے اعتبار سے یہ کچھ جلد ہی ہو رہا تھا۔ میں بھی فائدہ حاصل کرنے والوں میں سے تھا، ہمبرگ کی کاروباری اور پیشہ ورانہ روایات کے مطابق جس کے خون میں شامل تھا کہ 'دنیا دیکھو پھر کچھ کرو'، میں ہمیشہ سے نئی تہذیب اور نئے لوگوں کے تجربے کا خواہش مند تھا۔ صرف دیکھنے کی حد تک نہیں بلکہ ان کے ملک اور ماحول میں رہ کر تجربے کی خواہش رکھتا تھا۔ جس زمانے میں یورپ میں ہر شخص نئے سرے سے اپنی حیثیت کی شناخت بنانے اور کوئی مقام حاصل کرنے میں کوشاں تھا، ایک نوجوان جرمن کے لیے یہ بہت مشکل کام تھا۔

میرے دوستوں کو میری خواہشات کا علم تھا اور میری قسمت یا میرے مقسوم میں یہی لکھا تھا کہ بہت دور کہیں، کوئی مجھ جیسے ایک جرمن انسان کی تلاش میں ہے جس کو ایک ایسے جرمن کی جگہ لینی ہوگی جو اپنی ملازمت کی مدّت پوری کر لینے کے بعد اپنے وطن واپسی کا خواہاں تھا۔ میرے دوستوں کے ذریعے میرا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ اب میں اپنے میونخ ری کے ساتھیوں ہائنز ڈبلیو شوارز اور ولف گانگ برن ہارڈ کے ہمراہ کراچی کے میٹروپول ہوٹل سے، جس میں پاکستان آنے کے بعد میں ایک رات قیام کر چکا تھا، ایک پُرانی Vauxhall موٹر کار میں سوار ہو کر قمر ہاؤس کی طرف رواں تھا جہاں میری ملاقات ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر سے ہونے والی تھی۔

ان کا نام کے ایف حیدر (خوند کر فضلِ حیدر) تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہیں اور یہ بھی کہ غیر منقسم ہند، اور پاکستان کے قیام سے قبل ہی سے بڑے آدمی تھے، ریاست بھوپال کے وزیرِ خزانہ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اس سے پہلے خبر ہی نہیں تھی کہ ایسی کوئی ریاست تھی بھی، اس لیے کہ میں اس خطے کے جغرافیہ اور اس ریاست کے حدودِ اربعہ سے بالکل نابلد تھا۔ بس مجھے اتنا معلوم تھا کہ میں پاکستان کی سب سے بڑی اور سب سے پُرانی بیمہ کمپنی میں شامل ہونے جا رہا تھا، مسٹر شوارز کی جگہ جو ایسٹرن فیڈرل یونین کے صدر دفتر میں جنرل انشورنس ڈویژن کے تکنیکی معاملات کے سربراہ تھے۔ اس وقت میں دنیا کی سب سے بڑی 'ری انشورنس' کمپنی 'میونخ ری' کا ایک افسر تھا اور مسٹر شوارز اس شرط پر 'میونخ ری' واپس جاتے کہ میں خود کو ان کی جگہ لینے کا اہل ثابت ہوتا۔ عمر کے اعتبار سے تقریباً ہر ایک یہ سمجھ رہا

تھا (کم از کم آج میرا خیال یہی ہے) کہ شاید میرے تبادلے میں خطرات ہوں گے۔ جنوری ۱۹۶۰ء کی اس سنہری صبح مجھے کچھ خبر نہیں تھی اور میں بڑے اعتماد کے ساتھ اس انسان سے ملنے جا رہا تھا جس کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا، کچھ کتابیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ اگر چہ میں ان سے کچھ زیادہ اخذ نہیں کر سکا تھا۔ میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی، نہرو اور گاندھی کے بارے میں سُن چکا تھا، اور کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد اب میں جناح سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اب پاکستان پر ایک فوجی صدر، فیلڈ مارشل ایوب خان حکمرانی کر رہا تھا، جرمنی سے میری روانگی سے قبل جس کی ایک نہایت مرعوب کُن تصویر جرمنی کے اخبارات میں شائع ہو چکی تھی، اس لیے کہ وہ جلد ہی مغربی جرمنی کے دارالحکومت بون (Bonn) کا دورہ کرنے والا تھا۔

مجھے یہ بھی بتایا جا چکا تھا کہ مسٹر حیدر نہ صرف یہ کہ اس پاکستانی کمپنی کے سربراہ تھے، وہ سیاسی اعتبار سے بہت اہم اور رسوخ والے انسان تھے، کہ وہ پاکستان کے ایک سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم، کے بہت قریبی دوستوں میں سے تھے۔ آج چالیس برس بعد بھی مجھے یاد ہے کہ اس ملاقات سے قبل میں کتنا جذباتی ہو رہا تھا۔ دفتر کی جانب سفر کے دوران میں نے اطراف پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا، اگر چہ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے بائیں جانب کراچی کی بڑی مصروف بندرگاہ تھی اور یہ کہ سامنے نظر آنے والی بڑی سے عمارت قمر ہاؤس تھی جس کے اطراف، کراچی پورٹ ٹرسٹ کی عمارت کے ساتھ ہی، درجنوں اونٹ گاڑیاں اور ہزاروں گدھے بار برادری کے لیے منتظر تھے۔ اپنی زندگی میں اس سے قبل میں نے ایسا دل چسپ منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ وقت مشرق سے میری ملاقات کا نہیں تھا۔ پاکستان کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی کے جنرل منیجر، جس کو بیمے کی صنعت کا گہوارہ کہا جاتا ہے، جناب کے ایف حیدر میرے منتظر تھے۔

ان کا دفتر پہلی منزل پر تھا۔ اس وقت میں واقعی بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے ان گُلدانوں پر نظر نہیں کی تھی جو سیڑھیوں کے کونوں میں رکھے ہوئے تھے اور پان کی اُگال سے سُرخ ہو رہے تھے۔ میں نہ اس منظر سے کبھی آشنا تھا نہ میں نے اپنے ساڑھے چھ برس کے قیام میں کبھی پسند کیا تھا۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ حیدر صاحب کے سیکریٹری، ایک خوب صورت ریش والے اور عمر رسیدہ شخص نے ہاتھ ہلا کر ہمیں متوجہ کیا اور کہا، ''حیدر صاحب آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔'' انھوں نے دروازہ کھولا اور سب سے پہلے جو میں نے سنا وہ ایک گمبھیر اور دوستانہ آواز تھی، ''خوش آمدید حضرات، تشریف لائیے۔'' وہ ایک بڑی سے میز کی دوسری جانب تشریف فرما تھے۔ سب سے پہلے جو چیز میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ ان کی میز پر مشکل سے دو چار ہی کاغذ رہے ہوں گے۔ اور ایک چمک دار دھات کی بنی ہوئی گھنٹی، چائے سے بھری ہوئی ایک پیالی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور آہستہ سے آگے بڑھ کر انھوں نے مسٹر برنہارڈ کو، جو تبادلے پر سنگاپور جانے والے تھے، گلے سے لگایا۔ برنہارڈ صاحب سنگاپور جاتے ہوئے مجھے میونخ ری کے دوستوں سے متعارف کرنے کی غرض سے ایک مختصر عرصے کے لیے، جو تقریباً تین دن کے لگ بھگ تھا، کراچی ٹھہرے تھے۔ برنارڈ کے یہاں کے دوروں اور حیدر صاحب کے میونخ کے دوروں کے باعث ان سے سب لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے ہائنز شوارز سے مصافحہ کیا اور پھر آہستگی سے میری جانب متوجہ ہوئے اور بولے، ''تو میونخ سے آنے والے یہی ہمارے نوجوان دوست ہیں۔ ایسٹرن فیڈرل میں ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں، اس ادارے کو اپنا ہی سمجھیے۔'' اور یہ کچھ انھوں نے ایسے دوستانہ اور دل کو گرما دینے والے لہجے میں کہا کہ میں ایک ہی لمحے میں پُرسکون ہو گیا۔ کئی مہینوں سے میرے دل میں پیدا ہونے والے سارے سوالات اور تمام وسوسے یک دم کافور ہو گئے۔ اور چند ہی لمحوں میں اچانک یوں محسوس ہوا گویا میں سچ مچ اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔

میرے خیال میں جیسا کہ میں سمجھتا تھا، مجھے وہ اس سے کہیں مختلف لگے۔ میرے تصور کے بنائے ہوئے ہیولے سے کہیں چھوٹا اور بھرے بھرے جسم والا۔ بڑے سر پر گھنے ابرو اور دوستانہ نظروں والی آنکھیں۔ سر پر چھوٹے چھوٹے مگر سلیقے سے شانہ کیے ہوئے بال، جن کو دیکھ کر مجھے اپنے اسکول کے اساتذہ، بالخصوص مسٹر Hirmer یاد آ گئے۔ وہ ہمیں جرمن ادب اور تاریخ پڑھایا کرتے تھے۔ میں ان کا بہت احسان مند ہوں۔ وہی تھے جنھوں نے مجھ میں ماضی سے لگاؤ کا جذبہ پیدا کیا اور میری زندگی میں عظیم ماضی کے نقوش چھوڑے تھے۔ جی ہاں، جیسا کہ میں نے کہا ہے، حیدر صاحب ایک بیمہ کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کم اور تاریخ کے پروفیسر زیادہ لگتے تھے۔ انھوں نے سپید لینن کا سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا اور کلب کی ٹائی لگائے ہوئے تھے جو ان کے پاس کافی دنوں سے رہی ہوگی۔ اور جب وہ بیٹھے تو ان کے جیکٹ پر دو بہت واضح سرخ دھبے نظر آ رہے تھے جو اس وقت نہیں رہے ہوں گے جب ہم ان کے دفتر میں داخل ہوئے تھے۔ مگر ہم نے ان کو کچھ چباتے ہوئے دیکھا تھا جب، وہ ہاتھ بڑھا کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ دو حضرات جو پہلے سے کرسی نشین تھے ان میں سے ایک نے اچانک کہا تھا، ''حیدر صاحب آپ کی جیکٹ خراب ہوگئی ہے، کیا میں صدیقی کو آواز دوں۔'' جواب میں حیدر صاحب ہلکے سے مسکرائے اور کہنے لگے، ''معین فکر نہیں کرو، یہ پان کا ذرا سا دھبا ہے۔ گھر والے اس کے بارے میں کچھ کریں گے۔'' اور پھر انھوں نے ان دونوں حضرات کا ہم سے، یا یوں کہیے کہ مجھ سے تعارف کرایا۔ اس لیے کہ مسٹر برنہارڈ تو ان کو پہلے سے جانتے تھے۔ ان میں سے ایک تو جناب معین الدین، ای ایف یو، کراچی کی ایجنسی سیکشن کے منیجر تھے اور دوسرے امین صاحب، کمپنی کے چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ KFH نے (اب میں اختصار کی خاطر حیدر کا ذکر ان الفاظ میں کروں گا) کہا، ''مسٹر کرنوسکی آپ بہت کم عمر ہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی کم عمر، مگر ہم ایسا ہی چاہتے تھے۔ یہ آپ کے لیے فائدہ مند ہے اس لیے کہ اپنی کم عمری کے باعث آپ جنگ کے دوران ناتسی (نازیوں کو جرمن زبان میں ناتسی ہی پکارا جاتا ہے مترجم) یا فوجی نہیں ہو سکتے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ اس نسل سے ہیں جو برطانیہ مخالف نہیں، بلکہ اس قسم کے کسی طبقے کی مخالف نہیں۔ آپ میں نوآبادیاتی امتیازات قسم کی باتیں نہیں ہوں گی۔ آپ کے لیے یہ بات بہت فائدے کی بھی ہے اور بڑے امکانات کا باعث بھی ہوگی۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے نوجوانوں سے بغیر کسی تکلف کے دوستیاں کریں۔ وہ سب آپ کی معاونت کریں گے اس لیے کہ آپ خود دیکھیں گے کہ پاکستانی آپ کے ملک کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان، صحیح ہے یا غلط، ایک نوع کا تصور عام ہے کہ ہم اپنی آزادی کے سلسلے میں بالواسطہ آپ کے مقروض ہیں اس لیے کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عالمی جنگ دوئم ہی تھی جس کی وجہ سے برطانیہ نے اپنی نوآبادیات کو خیر باد کہا تھا۔ آپ اس ملک میں اپنے لیے راستے خود تلاش کریں۔ پاکستانی عوام میں گھل مل جانے کی کوشش کریں اور یقین کریں کہ یہ آپ کے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ بے شک اس سلسلے میں آپ کی مدد میں بھی کروں گا، مسٹر معین الدین، مسٹر امین اور کمپنی کے تمام لوگ آپ کی مدد کریں گے۔ آپ بالخصوص نوجوانوں سے ضرور ملیں، مثلاً میرے بیٹوں سے بھی، اس لیے کہ اس کمپنی کا مستقبل انھیں سے وابستہ ہے نہ کہ پرانی اور تاریخی نسل سے۔ اپنے ملک کے قیام کے لیے ہم اہم تھے، اب اس کو بنانے کے لیے دوسروں کی، یعنی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔'' ان الفاظ کو سن کر میرا خیال اور بھی پختہ ہو گیا کہ KFH تاریخ کے پروفیسر سے کسی طور بھی کم نہیں۔

خوب صورت الفاظ سے مزین یہ نہایت عمدہ تقریر تھی۔ میں نہ صرف بے انتہا متاثر ہوا بلکہ پُرسکون بھی ہو گیا۔ میں خاص کر اس بات سے بہت خوش ہوا کہ حیدر صاحب مجھ ہی سے مخاطب ہو کر باتیں کرتے رہے اور مجھے سوال جواب کے مراحل سے نہیں گزرنا پڑا جس کی مجھے بہت توقع تھی اور جس کے تصور ہی سے میری راتوں کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ اس کے برعکس میرے نقطۂ نگاہ سے یہ صورتِ حال زیادہ

حاکمِ ریاست کے قریب ترین اور معتمد ترین فرد سمجھے جاتے تھے۔ اردو زبان میں ایسے مناصب کے لیے خوب صورت الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ میرے لیے مشکل ہے مگر 'ریاست کا متولّی' Trustee of the Country اور 'سب سے اہم رُتبے والا شخص' Man of the Highest Rank شاید ان سے قریب ترین ہوگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عملی طور پر ہر معاملے میں، جس میں ہندوستان کی مسلم سیاست بھی شامل تھی اور نواب صاحب ذاتی دل چسپی بھی لیتے تھے، میرے والد سے مشاورت کرتے تھے۔ علی گڑھ کے دنوں سے ہی وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل میں اور تحریکِ آزادی میں اپنے کردار میں ذاتی دل چسپی لیتے تھے۔ اس زمانے میں ایک بیمہ کمپنی کھولنے کا خیال پیش کیا گیا تھا اور حتمی فیصلے کے بعد نواب صاحب نے اس کی سرپرستی قبول کی تھی۔''

حیدر صاحب کہتے تھے، ''وہ دنیا کا ایک حسین طبقہ ہے۔ تمھیں وہاں ضرور جانا چاہیے'' حیدر صاحب نے کئی بار مجھ سے کہا، جب انھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ہمبرگ سے آنے والے اس نوجوان نے ان کی توقعات کو پورا کر دکھایا تھا۔'' بھوپال کچھ پہاڑی علاقہ ہے، پرتگال کی مثل، یا باویریا (Bavaria) جیسا، اونچا نیچا، دریا، وافر پانی، اور فراواں سبزے کی جگہ۔ خوب صورت جنگلات، وحشی درندوں اور جانوروں سے پُر۔ ہماری زندگی دیہات جیسی تھی۔ ہمارے ہاں ۸۸ فی صد ہندو اور ۱۲ فی صد مسلمان باشندے تھے، آپس میں کوئی رنجش نہیں، کبھی ایک بھی فساد نہیں ہوا، ایک آدمی بھی نہیں مارا گیا۔ دونوں گروہوں میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ وزیرِ اعظم ہندو تھا۔ رمضان کے پہلے دن کی سحری ہندوؤں کی جانب سے مسجد بھیجی جاتی تھی۔ مسلمان ان کے ہولی اور دسہرے کے تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔ ہم رنگوں میں نہلا دیے جاتے تھے۔ اور ہمیں بہت لطف آتا تھا۔'' یہ ساری تفصیلات مجھے شہزادی عابدہ سلطان نے بھی بتائیں تھیں، جب میں ان کا انٹرویو کرنے کی غرض سے ان سے ملنے گیا تھا۔ اور حیدر صاحب بھی یہی کچھ کہا کرتے تھے جب وہ ریاست کے بارے میں باتیں کرتے تھے جہاں انھوں نے بہت اچھے اور کامیاب دن گزارے تھے۔ انگلستان سے واپسی پر مغربی بنگال کی ایک دوشیزہ سے شادی کے بعد وہ وہیں بس گئے تھے۔ ان کے پانچ بیٹوں میں سے چار بھوپال ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ سجاد پہلے تھے جن کی ولادت ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی، اور دوسرے مصطفیٰ تھے جو ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سجاد دبئی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ چارٹرڈ اکاؤنٹینسی انھوں نے لندن سے مکمل کی تھی جس میں کولنز کی عملی مدد شامل تھی۔ مصطفیٰ نے ۱۹۵۵ء میں سینئر کیمبرج کراچی گرامر اسکول سے کیا تھا جس کے بعد عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے وہ ایسٹرن فیڈرل سے منسلک ہوئے اور بعد میں سرویئر بن کر اپنا کاروبار کرنے لگے تھے۔ میں ان دونوں بیٹوں سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے کہ یہ دونوں میرے ہم عمر ہی تھے۔ ان دونوں نے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں میری بہت مدد کی تھی۔ بالخصوص مصطفیٰ نے شہزادی عابدہ سلطان، شعیب قریشی کی بیٹی بیگم قاضی اور صدیقی صاحب کی بھتیجی، ابوالحسن حسن اصفہانی مرحوم کی اہلیہ بیگم اصفہانی، سے میری ملاقات کے سلسلے میں میری بہت مدد کی تھی۔

حیدر صاحب نے قانون میں گریجویشن کیا تھا مگر وکالت کا پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ وہ سیدھے کاروبار میں لگ گئے اور اس کے بعد نواب بھوپال کے ساتھ ریاست میں انتظامیہ کے ایک اہم رُکن بن گئے۔ مصطفیٰ نے بتایا ''والد صاحب وکالت کو پسند نہیں کرتے تھے مگر ان کے دو بھائی اس پیشے میں گئے۔ حیدر صاحب کے بعد والے بھائی جسٹس زولعین فضلِ اکبر پاکستان کے چیف جسٹس بنے اور دوسرے بھائی فضلِ سبحان تقسیم سے قبل ہندوستان کی پولیس میں تھے۔ منقسم بنگال میں وہ ڈی آئی جی تھے۔ پاکستان بنا تو کچھ عرصے کے لیے انھوں نے خواجہ ناظم الدین کے ساتھ کام کیا جو پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل بنے تھے اور بعد میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک ملک کے وزیرِ اعظم رہے۔ ان کو

کراچی امپروومنٹ ٹرسٹ کا پہلا چیئرمین بنایا گیا تھا جس کا نام بدل کر KDA کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد نیروبی میں ملک کے سفیر رہے۔ ان کے لڑکے آج کل بنگلہ دیش میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اپنی پوری زندگی حیدر صاحب بنگال ہی کو اپنا اصل وطن جانتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہز ہائی نیس نواب آف بھوپال سے میری دوستی تھی جس کی وجہ سے میں اپنی جنم بھومی واپس نہیں جا سکا۔'' ای ایف یو میں ان سے نسبتاً قلیل عرصے قربت کے دوران بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ دل سے بنگالی تھے۔ اور جب بھی وہ دورے پر وہاں جاتے جس کو اس زمانے میں مشرقی پاکستان کہا جاتا تھا، ان کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا تھا۔

مگر شاید بھوپال میں قیام کے دوران ایسا نہیں رہا ہوگا۔ وہاں وہ ہمیشہ اپنے بہت قریبی دوستوں کے گھیرے میں ہوتے تھے۔ شعیب قریشی وزیرِ داخلہ تھے، راجا صاحب محمود آباد اور عبدالرحمٰن صدیقی برابر آتے جاتے رہتے تھے، کم از کم اس وقت تک جب وہ کلکتے کے میئر نہیں بن گئے تھے۔ ظفر اللہ خان وزیرِ خارجہ تھے۔ گویا روشن خیال حاکم کے اطراف باکمال افراد کا ایک حلقہ تھا جو ترقی پسندانہ فکر کے حامل تھے اور جنھوں نے پاکستان کی تشکیل اور اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ بھوپال ایک بہت اہم ریاست تھی۔ دراصل یہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی دوسری سب سے بڑی ریاست تھی۔ حیدرآباد سب سے بڑی تھی۔

جب ۱۹۴۷ء میں آزادی ملی، دوسری ریاستوں کی طرح ریاست بھوپال بھی ختم ہوگئی اگرچہ الحاق کے سلسلے کے کام دیر تک چلتے رہے۔ عام توقعات کے مطابق، اور ان کی بڑی صاحب زادی عابدہ سلطان کو بھی حیرت ہوئی، جو پاکستان کی بڑی پُر جوش حامی تھیں، کہ نواب صاحب نے ہندوستان کے مسلمانوں کے وطن پاکستان ہجرت نہیں کی۔ حالاں کہ انھوں نے موہٹا پیلس کے مقابل، جس کو نہ صرف جناح صاحب نے اور ان کے بعد ان کی بہن فاطمہ جناح نے سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا، ایک مکان خرید لیا تھا۔ موہٹا پیلس کی آرائش کر دی گئی ہے اور یہ عمارت کلفٹن کے رہنے والوں ہی کے لیے نہیں بلکہ دنیا بھر سے آنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ کل کی بے مثال عمارت بہت سے مشاہیر کے استعمال میں رہی مگر اس کے مقابل کی بہت بڑی عمارت ''بھوپال ہاؤس'' جو ایک محل معلوم ہوتی ہے، اپنی خارجی بے توجہی کے باعث ایک بھوت بنگلہ لگتی ہے جس میں برطانوی راج کا ایک بہت بارسوخ گھرانا رہا کرتا تھا۔ شہزادی عابدہ سلطان جو اب شہر سے دس میل دور ایک فارم ہاؤس نما جاگیر میں قیام پذیر ہیں اس عمارت میں شان سے رہا کرتی تھیں۔ اور ۱۹۵۲ء میں پاکستان ہجرت کے بعد حیدر صاحب، جو وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر قمر کورٹ میں رہتے تھے، برابر آتے رہے ہوں گے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں KFH نواب صاحب بھوپال کے بہت اہم رازداں اور مددگار ہو گئے تھے۔ اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ پاکستان بننے کے بعد وہ بھی بھوپال ہی میں رہ گئے تھے۔ انھوں نے اپنے اہلِ خانہ کو اپنے برادرِ نسبتی مرشد کے پاس کلکتے روانہ کر دیا تھا اس لیے کہ وہ اب نواب صاحب کے مستقل رفیق کے طور پر ملک کے اندر اور باہر سفر میں رہتے تھے۔ درحقیقت KFH اب نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے تھے اور چوں کہ نواب صاحب ایک مضطرب انسان تھے اس لیے KFH کو اپنے اہلِ خانہ کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔

اسی دوران وہ ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کے ڈائریکٹر بھی ہو گئے تھے جو اب کافی بڑی کمپنی ہوگئی تھی۔ اس ادارے نے قابلِ تعریف ترقی کر لی تھی اور اپنا کاروبار بہت پھیلا لیا تھا۔ مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک فیصلہ کرنا تھا کہ یہ ادارہ ہندوستان ہی میں رہے یا پاکستان ہجرت کر جائے اس لیے کہ اس کا بہت سارا کاروبار اب پاکستان منتقل ہو چکا تھا۔ بالآخر یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ کمپنی کو کلکتے سے کراچی

منتقل کر دیا جائے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے لیے یہ ایک بہت مشکل فیصلہ تھا مگر اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہی نہیں رہ گئی تھی اس لیے اور بھی کہ کئی بلکہ تقریباً تمام بنیادگزاروں کا سیاسی ماضی بھی پاکستان ہی سے منسلک تھا۔

۱۹۵۱ء میں مرزا احمد اصفہانی کا، جو ای ایف یو کے سب سے بڑے حصے دار اور چیئرمین تھے، خیال تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ کمپنی کا چیف ایگزیکٹیو کسی پاکستانی کو ہونا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے KFH کو اس عہدے پر فائز کرنے کا مشورہ دیا۔ کمپنی کے پہلے چیف ایک برطانوی مسٹر منہی تک تھے جو اٹلس انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر کے طفیل مستعار لیے گئے تھے۔ انھوں نے اس کمپنی کی چھ برس تک خدمت کی تھی اور ان کی جگہ ینوزی لینڈ کے مسٹر ٹی بیکسٹر تعینات ہوئے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے ماہرِ فن تھے مگر ان میں ایک غیر ملکی ملازم کے سارے لوازم موجود تھے، جن میں اہم لازمہ یہ تھا کہ وہ دورانِ ملازمت اتنی رقم اکٹھی کر لینا چاہتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد مالی اعتبار سے ان کی زندگی آرام سے گزر سکے۔ اس کے علاوہ بورڈ کی خواہش تھی کہ کمپنی کی ہجرت کے باعث اس کی پریمیم آمدنی میں جو کمی واقع ہوئی ہے اس کو پورا کرنے کے لیے کچھ مشکل فیصلے کیے جائیں جن کی وجہ سے کمپنی شدید مالی مشکلات سے گزر رہی تھی۔ ای ایف یو کی تاریخ کے اس ناخوش گوار باب پر میں نے تمام پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس منزل پر جو اہم بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ سیاسی اور تکنیکی وجوہات کی بنا پر مسٹر بیکسٹر کی تبدیلی ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انشورنس کے ایک جرمن ماہر مسٹر اروِن سی ایوان جن کو اصفہانی خاندان رنگون کے دنوں سے جانتا تھا، کمپنی کے نئے ڈپٹی جنرل منیجر متعین ہوئے اور ان کی اہم ذمے داریوں میں سے ایک عملی طور پر کمپنی کے صدر دفتر کی کراچی منتقلی بھی تھی۔

کچھ اِسی قسم کی صورتِ حال تھی جب اپنے پرانے دوستوں اور کمپنی کے چیئرمین جناب عبدالرحمٰن صدیقی اور پاکستان کے گورنر جنرل جناب غلام محمد کے اصرار پر مسٹر بیکسٹر کی جگہ جناب کے ایف حیدر نے بحیثیت جنرل منیجر سنبھالی تھی۔ جب مشکلوں میں گرفتار اس کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو حیدر صاحب بنے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں وہ بہت بارسوخ انسان تھے گو کہ وہ انشورنس کے شعبے کے آدمی نہ تھے۔ اپنے پورے عرصۂ حیات میں وہ ''اپنے'' نواب صاحب کے مخصوص اور قابلِ اعتماد نائب تھے اور وہ یقیناً اس نئی مملکت میں قدر اور اعتبار کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک کا ہر فرد دیکھ سکتا تھا کہ وہ گورنر جنرل اور ملک کے اعلیٰ افسران سے کتنے قریب تھے۔ ملک کے پہلے دارالحکومت کے سب سے اہم علاقے کلفٹن میں حیدر صاحب اپنے دوست غلام محمد سے ملنے جاتے جو ملک کی ایک کے بعد دوسری اہم ذمے داریاں سنبھالتے جا رہے تھے، اور دونوں اکٹھے سیر کو نکل جایا کرتے۔ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ گورنر جنرل کے دورۂ مصر اور مشرقِ وسطیٰ کے مندوبین میں حیدر صاحب بھی شامل تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دنوں حیدر صاحب بہت بارسوخ تھے مگر ایک انشورنس کمپنی چلانے کے لیے جو تکنیکی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں وہ حیدر صاحب کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔ لہٰذا بیمہ کمپنی کی تکنیکی مشین چلانے کا کام ان کے قد آور، خوش شکل جرمن نائب جناب ای سی ایوان کے ذمے تھا، انشورنس کے بارے میں جن کی تکنیکی اور پیشہ ورانہ مہارت ملک میں بیمے کی صنعت میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ مسٹر آئیون کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ لندن میں ای ایف یو کے انڈر رائٹنگ کے معاملات ٹھیک نہیں تھے اور حیدر صاحب نے کمپنی کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مسٹر آئیون کو لندن ایجنٹ کے کاغذات کے معائنے اور مسائل کے حل کی غرض سے فوراً لندن روانہ کیا۔ ان کی سخت کوش معاملاتی صلاحیت کے باعث ناگوار حقیقتوں پر سے پردے اُٹھ گئے اور بہت جلد یہ راز کھل گیا کہ کمپنی کے نقصانات اس کی مالی سکت سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس بات کا سہرا حیدر صاحب کے سر بندھنا چاہیے کہ پہلی بار کمپنی کی انتظامیہ نے کمپنی کی

بڑھتی ہوئی ناگفتہ بہ حالت سے بورڈ کو بلاکم وکاست مطلع کردیا۔

ان دونوں کی جوڑی بہترین تھی۔ حیدر صاحب ایک انشورنس کمپنی کی تکنیکی نزاکتوں سے نابلد تھے۔ ان کو کسی بڑی تجارتی انتظامیہ کو چلانے کا تجربہ بھی نہیں تھا مگر ان کو انسانوں کو جانچنے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ کسی کارکن کی صلاحیت کا احاطہ کرتے وقت اس کے قابلِ تعریف پہلوؤں پر پہلے نظر ڈالتے تھے۔ ای ایف یو کے موجودہ چیف ایجنٹ ابوالمحمود کے مطابق، جو صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے سے قبل ای ایف یو کراچی کے سب سے کامیاب، طویل عرصے سے اس کمپنی سے منسلک ایجنٹ تھے، ''وہ نہایت نفیس شخصیت کے مالک، ایک مکمل انسان تھے۔ وہ کسی کے بارے میں کبھی بُری بات نہیں کہتے تھے، معاملات میں سیاسی طریقہ تو نہیں اختیار کرتے تھے نہ وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی ٹھوس اور صائب رائے پیش کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کو خود تک بلا روک ٹوک رسائی دیتے تھے جو ان کے خیال کے مطابق کمپنی کے کاروبار میں ترقی میں ضروری اور معاون ہو سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ ان کی خاصیت تھی اس لیے کہ مجھ جیسے لوگ، بڑے کاروبار کرنے والے اسی وقت اپنی چمک دکھلا سکتے تھے جب نہ صرف وہ مالی منفعت سے نوازے جاتے بلکہ ان کی عقلی صلاحیتوں کا بھی اعتراف کیا جاتا۔ حیدر صاحب پر شاید ای ایف یو میں شمولیت سے پہلے ہی یہ راز منکشف ہو چکا۔ اور اسی وجہ سے وہ مجھ جیسے اچھے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔''

مسٹر آئیون اور ان کے بعد ۱۹۵۱ء میں کمپنی میں شمولیت کرنے والے ایک اور جرمن مسٹر ہائنز شوارز نے مل کر یہ یقینی بنادیا تھا کہ کمپنی کے کاروبار کی پیشہ ورانہ کیفیت برطانوی اور آسٹریلیشیائی کمپنیوں کے معیار سے کسی طرح کم نہیں ہونی چاہییں۔ انھوں نے اس بات کی بھی پوری کوشش کی کہ کمپنی کے دوسرے کارکنان میں بھی اپنے داخلی نظم وضبط کو منتقل کردیں۔ حیدر صاحب نے اس بات کو یقینی بنالیا تھا کہ کارکنوں کے جذبۂ خودنمائی کو موقع دیا جائے گا۔ وہ اپنے قریبی لوگوں کے ذاتی معاملات میں خاص طور سے گہری دل چسپی لیتے تھے۔

وہ اپنے اہلِ خانہ کو کافی وقت دیتے تھے، جو اُن جیسے منصب پر فائض لوگوں کے لیے ذرا مشکل ہوتا ہے۔ وہ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ کلفٹن کے علاقے میں واقع ان کا فلیٹ آرام دہ تھا مگر اتنا بڑا نہیں کہ ملک کی ایک بڑی مالیاتی کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو کے شایانِ شان ہو۔ ایسا تو اس کمپنی کے اوسط درجے کے افسران کے لائق ہونا چاہیے تھا۔ وہ صحیح معنوں میں دین دار انسان تھے، اپنے اہلِ خانہ سے محبت کرتے تھے اور اپنے ماتحتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے اخلاقی معیار بہت بلند تھے مگر ایسے نہیں کہ ایک عام آدمی کی ان تک پہنچ نہ ہو سکے۔ ابوالمحمود نے ایک مخصوص قسم کا واقعہ بیان کیا جو پیشِ خدمت ہے۔

''لائف ڈپارٹمنٹ کے ایک ایجنٹ کو لائف منیجر جناب ریاست اللہ نے چوری کی بنا پر برخاست کردیا تھا۔ اگرچہ رقم زیادہ بڑی نہ تھی مگر اس عمل کو برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد اس کو معاف کردیا گیا اور کمپنی میں واپس لے لیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کارکن نے انشورنس کا نسبتاً ایک بڑا جرم کیا۔ لہٰذا اس کو پھر برخاست کردیا گیا مگر اس بار اس کا نام اخباروں میں شائع بھی کردیا گیا۔ چھ سات ماہ بعد وہ کارکن اپنی خطا پر بے حد شرمندہ واپس آیا اور عاجزی سے معافی کا طلب گار ہوا۔ ریاست اللہ صاحب اس کو لے کر حیدر صاحب کے روبرو گئے اور اُس کی اِس شرط کے ساتھ سفارش کی کہ وہ تحریری طور پر یہ وعدہ کرے کہ وہ اب کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ حیدر صاحب نے پہلے تو تحمل سے سب کچھ سُنا پھر اچانک طیش میں آگئے۔ انھوں نے ریاست اللہ صاحب کی سخت سرزنش کی اور خود ان کو برخاست کرنے کی دھمکی دی اگر وہ آئندہ پھر کبھی اس قسم کی تجویز لے کر آئے۔ انھوں نے کہا 'ریاست اللہ، آپ لائف منیجر ہیں اس لیے اس

آدمی کو واپس لینے کا فیصلہ صرف آپ کر سکتے ہیں۔ آپ جایئے اور جو کچھ آپ درست سمجھتے ہیں کیجیے۔ آپ اگر مجھ سے اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ میں اس کے اس تحریری وعدے پر یقین کرلوں کہ وہ پھر کبھی ایسا نہیں کرے گا تو آپ مجھے غیظ وغضب کی دعوت دیں گے۔ میں کسی سے تحریری وعدے لینے میں یقین نہیں رکھتا۔ ریاست اللہ آپ نے دیکھا ہے کہ میں نے اللہ کے سامنے کتنی غلطیاں کی ہیں مگر اللہ نے کبھی مجھ سے کبھی کوئی تحریر نہیں طلب کی۔ تو پھر تحریر طلب کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آپ کو کسی پر اعتماد ہے تو اس میں اور بھی اعتماد پیدا کیجیے مگر پہلے اپنے آپ کو اتنا بلند کیجیے، تاکہ وہ دوبارہ جرم کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اس آدمی کو بہتر بنانا آپ کی ذمے داری ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کو اچھا بنانے میں ناکام رہے ہیں اسی لیے اس نے بُرے کام کیے ہیں۔ اور پھر انھوں نے اسی قسم کی بہت سی دانشورانہ باتیں کیں جواب مجھے یاد نہیں، بہت سال گزر چکے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے، 'محمود، میرے کئی بگڑے ہوئے بیٹے ہیں، جن میں سے ایک تم ہو، مگر میں سبھوں سے محبت کرتا ہوں۔''

شرافت والا جاہی جو اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانے سے قبل حیدر صاحب کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے، کہتے ہیں کہ ''حیدر صاحب بہت پیارے انسان تھے۔ وہ مجھ پر اور میری اہلیہ پر بہت مہربان تھے۔ ہم دونوں ان سے ملاقات کے لیے اکثر ان کے فلیٹ جاتے تھے۔ وہ میرے لیے باپ جیسے شفیق تھے۔ ایک بات جو وہ میرے سامنے بار بار دہراتے تھے: ''شرافت، ایک بات زندگی بھر یاد رکھنا۔ جو کچھ بھی کماؤ، ہمیشہ اس کا پچاس فی صد پس انداز کیا کرو۔ اگر چہ میں ان کے مشورے پر کبھی عمل نہیں کر سکا مگر اس مشورے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کیسے انسان تھے۔ اس لیے کہ جو کچھ وہ کہتے تھے اس پر ایمانداری سے یقین بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی، وہ بہت اچھی انگریزی بولتے تھے، اور بہت خوب صورت زبان لکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو ایک ہی سطح کا سمجھتے تھے۔ اس کے پیشِ نظر کہ ان کا پس منظر ریاستی افسر کا تھا، میرے نزدیک ان کا یہ طرزِ عمل بہت بڑی بات تھی''

حیدر صاحب بہت ذمے دار، بھروسے کے قابل، صاف گو انسان اور لگی لپٹی بغیر اپنے خیالات سچ سچ بیان کر دینے کے قائل تھے۔ وہ اپنے الفاظ کو کبھی توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتے تھے اگر چہ ان کے کچھ زیادہ فلسفیانہ تبصرے ٹھٹھول جیسے لگتے تھے۔ مگر وہ جس انداز میں ان کو بیان کرتے تھے اس میں بھی حسن اور ان کی شناخت کا پہلو ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی ہلکے پن کے ساتھ پیش نہیں کیا نہ ہی وہ کسی سے سستی تعریف کی توقع رکھتے تھے۔ ان کی دانائی، بذلہ سنجی اور صاف گوئی تقریر کے جواہر سے مزیّن ہوتی، ان کی گفتگو بے شمار صوتی italics اور استعجابی نکات کے پردوں میں لپٹی ہوئے جملے کے ذریعے اپنے اصل پیغام کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اس کے حرف حرف پر پورا یقین رکھتے تھے اور جو بھی ان کا مخاطب ہوتا پوری طرح سمجھ جاتا تھا۔ یہی ان کی سب سے بڑی طاقت تھی جس نے ان کی شخصیت کو، شرافت والا جاہی کے الفاظ میں، ارفع بنا دیا تھا۔ نہ وہ کوئی ٹیکنو کریٹ تھے نہ دانشور مگر وہ ہمیشہ اسی پر یقین رکھتے تھے جو انکے نزدیک حق ہوتا تھا۔ ان کا اعتماد غیر متزلزل تھا۔ ان کے رفیقِ کار Mr Iven نے ایک بار کہا تھا کہ ''وہ ایک گدھے کو بھی گانے کا موقع ضرور دیں گے اگر ان کے نزدیک وہ صحیح آوازیں نکالنے پر قادر ہو'' ظاہر ہے کہ میں اپنے آنجہانی رفیقِ کار کو جھٹلانا ہرگز پسند نہیں کروں گا جو مجھ کو پہلے میونخ ری میں لے گئے پھر ای۔ ایف۔ یو میں لے آئے۔

جیسا کہ میں حیدر صاحب کے اس خاکے کے شروع کے صفحات میں بیان کر چکا ہوں، میری ان سے پہلی ملاقات کراچی آمد کے دوسرے دن ہوئی تھی۔ اور یہ وہی زمانہ تھا جب ای۔ ایف۔ یو لندن میں ہونے والی غلط انڈر رائیٹنگ کی انتہائی مشکلات سے دوچار تھی۔ حسن

اتفاق سے ان ہی دنوں حیدر صاحب کے ذاتی معاملات میں ایک اہم لمحہ آ گیا تھا جب حکومتِ پاکستان نے ان کو پاکستان انشورنس کارپوریشن کی سربراہی کی پیش کش کی تھی جو ان ہی کے ایما پر ۱۹۵۳ء میں قایم کی گئی تھی۔ PIC ایک ری انشورنس کمپنی تھی جو، جہاں تک ممکن اور مناسب ہو، مقامی کاروبار کو تحفظ اور مدد فراہم کرنے کی غرض سے وجود میں آئی تھی۔

حیدر صاحب نے، جو بلا شبہ ملک میں بیمے کی صنعت کے عمائدین میں سب سے اہم تھے، یہ پیش کش قبول کر لی۔ میرے خیال میں یہ ایک سمجھ میں آنے والا فیصلہ تھا۔ مگر ایسے فیصلہ کُن مرحلے پر ای ایف یو سے ان کی علاحدگی متضاد قسم کی چہ می گوئیوں کا باعث بنی تھی۔ اس لیے میں اس مقام پر وہ باتیں دہرانا چاہوں گا جو پہلے کہی جا چکی ہیں۔

جب یہ سب کچھ ہوا میں موجود تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ حیدر صاحب کا PIC میں جانے کا فیصلہ کسی طرح بھی ایک تباہ شدہ جہاز کو چھوڑ کر اپنی جان بچا لینے کا عمل نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان کے سب سے اہم ادارے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے حکومتی پیش کش ان کو قبول کرنی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ جب انھیں یہ پیش کش کی گئی اور سفینے کا ناخدا اس کو قبول کر رہا تھا اس وقت لندن میں ہونے والے نقصانات سے پیدا ہونے والا انتشار اپنے عروج پر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس پیش کش سے پہلے ہی ای ایف یو ایسے طوفان میں گھر چکی تھی کہ اس کا دیوالیہ ہو جانا تھا مگر یہ حیدر صاحب کی تجربے کاری اور تاخیری حربے کا استعمال تھا جس کی بنا پر کمپنی کو سانس لینے کی فرصت مل گئی اور ۱۹۶۱ء میں کمپنی کی باگ ڈور سنبھالے والے جناب روشن علی بھیم جی اور نئے چیئرمین جناب عباس خلیلی نے لندن کے قرض خواہوں سے معاملات کر لیے اور اتنے اہم اور بڑے ادارے کو دریا بُرد ہونے سے بچا لیا۔

جب یہ خوش خبری کراچی پہنچی تو سب سے زیادہ خوشی حیدر صاحب کو ہوئی اور وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ادارے کو بچا لینے والے دو حضرات کو مبارک باد پیش کی تھی۔ میں اکثر ان سے ملنے ان کے دفتر چلا جایا کرتا تھا جو قمر ہاؤس سے چند گز کے فاصلے پر، میری ویدر ٹاور سے متصل اس سڑک پر واقع تھا جس کو بانیِ پاکستان کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ ان کا دفتر جس عمارت میں تھا وہ بہت پُرانی، بدنما اور بہت گہرے رنگ کی تھی۔ پھاٹک پر فوج سے فارغ شدہ نگہبان اور بے شمار نیم خوابیدہ چپراسیوں کا ہجوم۔ ہر طرف مثالی افسرِ شاہی کا ماحول۔ حتیٰ کہ راہ داریوں میں پھیلی ہوئی بو میں بھی نالائقی اور سخت کوشی بسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ حیدر صاحب وہاں کے ماحول سے خوش نہیں دکھائی دیتے تھے۔ وہ اپنے ادارے کے مستقبل کی بات کرنے کے بجائے ہمیشہ گھوم پھر کر ترقی کرتی ہوئی ای ایف یو کا ذکر چھیڑ دیتے۔ ایسٹرن فیڈرل کے اندر یا باہر کہیں کوئی بھی تقریب ہوتی تو حیدر صاحب کو ضرور مدعو کیا جاتا۔ اور ایسی پیش کشوں پر وہ اپنی خوشی کا کھل کر اظہار کرتے۔

حیدر صاحب بہت منکسر المزاج انسان تھے۔ اگر چہ ان کی زندگی سماجی چکا چوند سے بھری ہوئی تھی، اور وہ اپنے وقت کے مشاہیر کے ساتھ ہمہ وقت عوام کی دل چسپی کے مرکز رہے تھے مگر ایسا لگتا تھا گویا انھیں اس سے کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ شطرنج کی ایک بازی یا برج کے چند ہاتھ کھیل لینا ہی ان کی سب بڑی تفریح تھی۔ باتیں کرنے میں ماہر مگر سننے کے معاملے میں بھی بہت صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ شاید ان کی یہی خوبیاں تھیں، ان کے مربّی نواب صاحب بھوپال جن کی بہت قدر کرتے تھے اور ان دونوں بڑے لوگوں کے کردار میں جتنا فرق تھا جتنا شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔

میں نے انھیں آخری بار ۱۹۶۳ء میں دیکھا تھا۔ وہ پہلے کُل پاکستان انشورنس کنونشن میں شریک تھے جو کنٹرولر انشورنس مسٹر زال کنٹریکٹر کے ایما پر منعقد ہوا تھا جس میں کچھ غیر ملکی مندوبین بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ بہت کامیاب کنونشن تھا اس لیے کہ پہلی بار پاکستان کی

یمے کی صنعت کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا جارہا تھا۔ اُن کی پُرانی کمپنی ان دنوں اپنے عروج کے دور سے گزر رہی تھی اور جب روشن علی جیم جی نے اپنے اہم خطاب میں حیدر صاحب کا نام لے کران کو پاکستان میں بیمے کی صنعت کے باپ کے نام سے یاد کیا تو وہ بہت متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے بعد سے تقریباً ہر شخص ان کے کردار کو سراہتا رہا۔ حیدر صاحب نے بحث میں حصہ بھی لیا اور جب حیدر صاحب نے تقریر کی تو برسرِ عام جناب امیر علی فینسی کے، جو اس وقت نیو جوبلی کے چیئرمین اور اسماعیلی فرقے کے رہنما تھے، اس بات پر لتے لیے کہ وہ حکومت کے کچھ اعمال پر تنقید کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''آپ لوگ اپنے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ آپ لوگ پالیسی ہولڈروں کی کم زوریوں سے فائدے اُٹھاتے ہیں اور ان کو دھوکا دیتے ہیں۔ پہلے سال کے پریمئم پر آپ لوگ ایجنٹوں کو جتنا کمیشن دیتے ہمیں وہ زیادتی ہے، جرم ہے۔ اپنے اداروں کو مستحکم بنانے کے بجائے آپ لوگ بڑے بڑے منافعے ہڑپ کر کے عوام کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔'' مجھے یقین ہے کہ اس اجلاس کے حاضرین حیدر صاحب کی تقریر کو کبھی نہیں بھولے ہوں گے۔ ان کے بیٹے سجاد حیدر بتاتے ہیں کہ جب وہ گھر واپس پہنچے تو بہت تھکے ہوئے، افسردہ اور بیمار دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے گھٹنوں میں درد کی شکایت کی اور اہلِ خانہ نے کمپنی کے معالج ڈاکٹر سعید خان کو، جو حیدر صاحب کے بھی ذاتی معالج تھے، بلا بھیجا۔ انھوں نے حیدر صاحب کو انجکشن دیا۔ مگر ان کے دل نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور ۱۸ر مارچ ۱۹۶۳ء کی رات تین بجے وہ بغیر کسی مزاحمت کے، خاموشی سے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

دوسری صبح کے اجلاس میں مندوبین نے ان کے احترام میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔ ایک بہت بڑے مجمعے نے، جس میں ای ایف یو کے لوگ، PIC کے ملازمین، وزارتوں کے نمائندے، ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کی کثیر تعداد شامل تھی، ان کو آخری سلام کیا جب ان کا خاکی جسم لحد میں اُتارا جارہا تھا۔

نگرانِ کار

عباس خلیلی	اصفہانی خاندان
راجا صاحب محمود آباد	اراگ خاندان
ایس ایم یوسف	سعید احمد
جہانگیر صدیقی	محمد علی سعید
جسٹس میاں محمد محبوب	اشرف تابانی

عباس خلیلی

کراچی میں چیئرمین عباس خلیلی ای ایف یو کے ۱۹۶۳ء کے کنونشن میں آنے والے وفود کے استقبالیہ سے خطاب کررہے ہیں

ای ایف یو کے چیئرمین عباس خلیلی اپنی رہائش گاہ 'سیون برکس' پر مینیجنگ ڈائریکٹر روشن علی بھیم جی کے ساتھ ری آرگنائزیشن کمیٹی' کی فائنل رپورٹ وصول کرتے ہوئے، تصویر میں شرافت علی والا جاہی ساجد زاہد اور وولفرام کرنوسکی بھی موجود ہیں

عبّاس خلیلی

ہمارے مدراسی ساتھی

''ہندوستان اور پاکستان نے جتنے بھی اعلیٰ درجے کے سرکاری افسر پیدا کیے ہیں، عباس خلیلی ان میں سے ایک ممتاز افسر تھے ہیں۔ وہ خداداد نعمتِ عقل وخرد اور جلد فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے مالک تھے۔ صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ تھے۔ وہ عوام کے سچے خادم تھے، ایسے خادم نہیں جو صرف اپنی حکومت کے فرماں بردار ہوتے ہیں۔''

یہ الفاظ اس شخصیت کے قریب ترین دوستوں میں سے ایک کے ہیں، جو ۱۴ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو محمد خلیلی نامی شیراز کے ایک متموّل تاجر، رئیسِ قبیلہ اور مریم نمازی کے گھرانے میں پیدا ہوا، جب مریم اپنے والدین کے گھر مقیم تھیں۔ عبّاس اپنے تیرہ بھائی بہنوں میں نویں نمبر پر تھے۔ محمد خلیلی شیرازی نے چھ برس کی کچی عمر میں شیراز چھوڑا تھا جہاں سے وہ کشمیر گیا اور وہاں ۱۴ر برس کی عمر تک مقیم رہا۔ پھر یوں ہوا کہ نمازی نام کے اس کے ایک عم نے جو متمول تاجر تھا اس کو مدراس طلب کیا تا کہ اس کی شادی اپنی خوب صورت بیٹی سے کر دے۔ ضیا خلیلی کے بیان کے مطابق عباس خلیلی کے والد مدراس ہی میں بس رہے، اس بیٹی کو اپنے خاندان میں لے لیا اور بعد میں اس کا کاروبار بھی۔ محمد خلیلی نے اپنی عم زاد سے شادی کر لی اور اپنی تمام زندگی مدراس ہی میں گزار دی۔ تجارت میں انھیں بہت کامیابی ہوئی اور وہ مدراس شہر کے بہت بڑے صاحبِ جائیداد بن گئے۔ نمازی خاندان کے لڑکے اپنی خوبروئی، وجاہت اور طرزِ حیات کی وجہ سے خواتین میں بہت مقبول ہوتے تھے۔ یہ لوگ محنتی اور جفاکش نہیں تھے مگر محمد خلیلی ایسے تھے۔ وہ توانائی سے بھرپور اور ہمت والے تھے جن کو اوائلِ عمری ہی میں اپنے خسر کے کاروبار ''نیل'' (Indigo) کا بوجھ اُٹھانا پڑا۔ نیل کی کاشت مرکزی ہندوستان اور آندھرا پردیش میں ہوتی تھی اور وہیں سے افریقا برآمد کی جاتی تھی جو اس کی سب سے بڑی منڈی تھا۔ حالاں کہ وہ مقامی زبان نہیں بول سکتے تھے، بس تھوڑی بہت انگریزی سے کام چلاتے تھے مگر وہ بہت کامیاب تاجر بن گئے اور انھوں نے اپنا اصول یہ بنایا تھا کہ کہ وہ اپنی کمائی ہوئی ساری رقم جائیداد میں لگائیں گے۔ وہ بہت دور اندیش اور لچک رکھنے والے انسان رہے ہوں گے اس لیے کہ صدی کے دوسرے عشرے میں جب جرمنوں نے مصنوعی کیمیائی مادّوں سے مصنوعی نیل بنانی شروع کر دی تو ان کا روبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ دور اندیش تاجر نے فوراً اپنے کاروبار کا رُخ موڑ دیا اور ہندوستان کے سب سے کامیاب تاجروں کی فہرست میں سے اپنا نام خارج نہیں ہونے دیا۔

عباس خلیلی مدراس میں اسکول میں جاتے اور راستے سے دوستوں کو اپنی سواری پر بٹھاتے جاتے۔ ان میں سے ایک جلال الدین رحیم، سر عبدالرحیم کے بیٹے، تھے جو آئی سی ایس میں کامیاب ہو کر سرکاری افسر بنے اور بعد میں پیپلز پارٹی کے بانی اور وفاقی وزیر بنے۔ دوسرے دوست کرامت تھے، سر محمد بذل اللہ، جنھیں آئی سی ایس میں محمد کرامت اللہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

عباس بہت اچھے کھلاڑی تھے، ہاکی کھیلنے کے ایسے شوقین تھے کہ جب ان کو تعلیم کے لیے، ان الفاظ میں، ملک سے باہر بھیجے جانے

کا خیال پیش کیا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کے الفاظ میں، ''عبّاس بہت ذہین ہے، اس کو تعلیم کے لیے انگلستان جانا چاہیے'' اور وہ وہاں بھیج دیے گئے۔ ان کو انگلستان جانے والے بحری جہاز پر سوار کر دیا گیا۔ ان کے بڑے بھائی برسٹل میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ لندن اور دوسری جگہوں پر اور بھی جاننے والے لوگ تھے۔ مگر وہ خود کو بہت اداس اور تنہا محسوس کرتے تھے کہ، اچانک اپنے پیارے اسکول اور اپنے کئی دوستوں سے دور کر دیے تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ برس کی تھی۔ وہاں ان کو اسکول میں داخل نہیں کرایا گیا۔ وہ گھر پر ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے لندن میں میٹرک کرنے کے بعد Brasenose College آکسفرڈ میں داخلہ لے لیا جہاں وہ چار برس تک، یعنی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء تک، تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے اوّل درجے میں اعزاز کے ساتھ اصولِ قانون میں گریجویشن کیا اور اپنے کالج کے اعزازی فیلو منتخب کیے گئے۔ انھوں نے آکسفرڈ ہی سے BCL کیا اور ۱۹۳۰ء میں Inner Temple سے بیرسٹر فارغ التحصیل ہوئے۔ اپنے دوسرے امتحانات کے ساتھ وہ ICS کے مقابلے کے امتحانات میں بھی شریک ہوئے۔ ایک سال آکسفرڈ میں رہنے کے بعد ممتاز لوگوں کے حلقے، یعنی ICS میں مدراس کے مرکزی حلقے سے شریک ہوئے۔

اپنے ہم عصروں کے بارے میں وہ بہت خوش قسمت تھے۔ ان ہی دنوں ہمایوں کبیر (مولانا آزاد کے معتمد)، فضل الرحمٰن، معین الدین (جنھوں نے ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں نتائج آنے سے پہلے ہی ایوب خان کو منتخب قرار دے دیا، تھا) اشاعت حبیب اللہ (ایک آتش زیرپا جو آرام کرسی میں بیٹھے فسادات کے قانون پڑھا کرتے تھے)۔ فرینک مورائس ہوتھے سنگھ (جنھوں نے جواہر لال نہرو کی بہن سے شادی کی تھی) دوسو کرا کا (پہلے ہندوستانی جو آکسفرڈ یونین کے صدر بنے) اور MCC کے نامور کرکٹر پٹودی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

خلیلی ضرور ایک نمایاں اور ذہین طالب علم رہے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ، جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، وہ ایک وقت میں مختلف النوع موضوعات اور امتحانات دینے کے قابل تھے اور یہی خصوصیت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ ان میں بہت اعلیٰ درجے کی دانشورانہ صلاحیتیں رہی ہوں گی۔ وہ تیز طرّار، نہایت شائستہ تھے، اور بلاشبہ اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایسے طالب علم تھے جن پر کوئی بھی یونی ورسٹی فخر کر سکتی تھی۔ اسی لیے طالب علم کی حیثیت سے وہ آکسفرڈ کے مختلف کالجوں میں گردش میں رہتے اور تمام مشاہیر، اور صرف معروف پروفیسروں کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ انھوں نے ان مشاہیر میں سے کسی کو مایوس نہیں کیا۔ ان کا ذہن بہت درّاک تھا، ان کی دانش میں اعلیٰ درجے کی ہم آہنگی تھی، اور کبھی تناؤ کا شکار نہیں ہوتے تھے، ہمیشہ پُرسکوں اور خود اعتمادی سے پیش آتے، جس کو دیکھ کر لوگ ان کو عیّار اور متکبّر سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امتحان کے دوران پروفیسروں میں سے ایک نے، جو بہت معزز اور محترم سمجھے جاتے تھے، ان سے پوچھا کہ ''مسٹر خلیلی، آپ نے سُنا ہوگا کہ مشہور انگریز مفسّرِ قانون فرانسس بیکن کے سامنے جج حضرات تخت کے نیچے کے شیر (یعنی جج ان کے تخت کو سنبھالنے والے پائے کی مثال تھے) کے مماثل ہوتے تھے۔ تو پھر یہ بتایئے کہ ایڈورڈ کوک جیمز کے زمانے میں، جو پہلی بار ان کے جانشین منتخب ہوئے تھے، ججوں کا کیا رُتبہ ہوتا تھا؟'' اور بلا کسی جھجھک کے خلیلی کا (نہایت شاعرانہ) جواب تھا کہ ''کوک کے زمانے میں وہ بے زنجیر (یعنی آزاد) تھے۔'' اس بے جھجھک جواب ہی پر ان کا امتحان ختم ہو گیا اور ان کے ممتحن حضرات نے مسکرا کر ''بہتر'' کہا اور ان کو اوّل درجے میں کامیاب قرار دے دیا۔

عباس خلیلی کو انگلستان بہت بھا گیا تھا۔ وہ انگلستان والوں کو پسند کرتے تھے اور یقیناً کچھ مالک مکان خواتین سے ان کی خوب صورت یادیں وابستہ تھیں۔ جو کچھ انھوں نے اپنے دوستوں کو بتایا اس کے مطابق وہ ان جیسے نوجوان آدمی پر بہت مہربان تھیں۔ اپنے دوستانہ پن اور وسعتِ نظر کی وجہ سے ان کے ساتھ کے طالبِ علم ان کو بہت پسند کرتے تھے، حالاں کہ وہ ورائے تعلیم، یعنی کھیل کود، تقریری مقابلوں یا کسی اور قسم کی غیر تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں ان کے والد کا کاروبار زوروں پر تھا اس لیے مالی طور پر وہ بہت خوشحال رہتے تھے اور اپنے آکسفرڈ کے دوستوں کے مقابلے میں کافی آسائش میں تھے۔ ان کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ جب

انھوں نے ایک نئی موٹر کار خریدی تو پٹرول کی ٹنکی لبالب بھر کر پُرانی کار کو کسی سڑک کے کنارے چھوڑ دیا اور کار کی چابی انجن کے تالے میں لگی چھوڑ کر چل دیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں، ۱۹۲۷ء کے مالی بحران کے زمانے میں، استعمال شدہ کاروں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی تھی۔ آج کل کی ماحولیات کے اعتبار سے یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہوگی مگر اس کے باوجود یہ ایک دل چسپ بات ہے جس سے نوجوان خلیلی کی مالی حالت اور طالب علی کے زمانے میں انگلستان میں ان کے ان کے طرزِ زندگی کا پتا چلتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں انگلستان میں ان کی تعلیم ختم ہوئی اور جب وہ مشکل سے چوبیس برس کے تھے انھوں نے ICS میں شمولیت اختیار کر لی، معیار کے ہر زاویے سے یہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی۔

چوں کہ مدراس سے آئے تھے اس لیے ان کی پہلی تعیناتی مدراس ہی میں، بلکہ شہر کے باہر کے ضلعی دفتر میں ہوئی۔ وہ ایک عام سرکاری افسر کی سی زندگی گزار رہے تھے، جو ان کے نزدیک تنہائی کی زندگی تھی اور غالباً یہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کے اوائل کا واقعہ ہے کہ انھوں نے شادی کر لی۔ ان کا پہلا بیٹا ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ ان کی بیوی ان کے چھوٹے چچا کی اکلوتی اولاد تھیں۔ اور خاندان میں یہ اچھی جوڑی تھی۔ ان دنوں ان کی تنخواہ ۴۵۰ روپے ماہانہ تھی۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ خلیلی صاحب کے بیٹے ضیا خلیلی بتاتے ہیں کہ ''اس پر مستزاد یہ کہ ان کے دادا بھی مالی امداد کے لیے مستعد رہتے تھے مگر اتنی زیادہ نہیں اس لیے کہ چھوٹے شہروں میں رہ کر آپ کتنی رقم خرچ کر سکتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں یوں ہی ہوتا ہے کہ وہاں خاندان بھی ہیں اور خاندانوں کے درمیان تعامل بھی ہے۔ عموماً بے شمار بھائی بہن ہوتے ہیں، ان دنوں ہمارا خاندان برصغیر کا ایک مثالی خاندان تھا جس کے رشتے جنوب مشرقی ایشیا میں تقریباً ہر جگہ تھے۔ پورے خاندان میں صرف میرے والد تھے جو سرکاری ملازمت میں تھے۔ باقی تمام کسی نہ کسی طرح کے کاروبار میں تھے۔ دادا جان کی کمپنی کافی دنوں تک چلتی رہی، اس وقت تک جب ۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہوا، اور ان کے بعد ان کی بیوی کا بھی۔ پورا خاندان مختلف نوعیت کے کاروبار میں تھا، جس میں جہاز رانی بھی شامل تھی۔

دادا جان کو جہاز رانی کا کاروبار پسند نہ تھا۔ مگر یہ ان پر تھوپ دیا گیا تھا، اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے عم زاد کو جو سنگاپور میں تھے مالی مشکلات سے نجات دلائی تھی۔ عم زاد سنگاپور کے بڑے آدمیوں میں سے تھے، ربر کے باغات تھے، انگریز جن کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ ان کے پاس تیس، چالیس جہاز تھے۔ اس طرح وہ واقعی بڑے آدمی تھے۔ ان کے جہاز کوئن میری کے برابر کے نہیں تھے، مگر وہ سب گہرے سمندروں میں چلنے والے جہاز تھے، مال بردار اور مسافر بردار جن پر حج پر سفر کرنے والے جایا کرتے تھے۔ جب ان کا دیوالیہ ہونے لگا تو خاندان والوں کا خیال تھا کی دادا کو ان کی امداد نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر دادا جان نے اصرار کیا کہ 'ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ دولت اچھے کاموں میں صرف کرنے ہی کے لیے ہوتی ہے۔ میں ان کو دیوالیہ نہیں ہونے دوں گا۔'' اس طرح انھوں نے بینکوں کے قرض چکانے کے لیے رقم فراہم کر دی، اور ان کے سارے جہاز واپس مل گئے، اس خاندان کو جسے جہازوں کی تجارت کے لیے چلانے کا تجربہ نہ تھا۔ اور یہ واقعی اس بات کا ثبوت ہے کہ خاندان کے مزاج میں، دادا جان جس میں شامل تھے، دولت کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔''

حقیقت یہ ہے کی اس واقعے کا سارے خاندان کے کاروبار پر اثر پڑا اور جب عباس خلیلی کے والد کا انتقال ہوا، سب بھائی الگ الگ ہو گئے مگر وہ خود سول سروس ہی میں رہے جس میں ان کو بہت لطف آتا تھا۔ ضیا کہتے ہیں کہ ''ہر شخص سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایرانی النسل مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم کسی بھی اعتبار سے مرکزی دھارے میں شامل نہیں، نہ ہندو، نہ انگریز، نہ پارسی نہ ہی ہم لوگ مسلمان اکثریت میں سے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کی افسر شاہی میں ساتھیوں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مثال کے طور پر راج گوپال اچاریہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے، جو ولبھ بھائی پٹیل کی طرح آزادی کے با اثر رہنماؤں میں گنے جاتے تھے، گاندھی جی، فولادی

اعصاب کے مالک 'راجا جی' کو اپنے ضمیر کا رکھوالا کہتے تھے۔ اُس وقت راجا جی آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل تھے۔ ان کا تعلق بھی مدراس سے تھا اس لیے خلیلی صاحب انھیں قریب سے جانتے تھے، بلکہ بعض حالات میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ وہ راجا جی کو 'دیونما انسان' کہتے تھے۔

مختلف اضلاع میں اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنے کے بعد ان کو ۱۹۳۶ء میں مدراس حکومت میں 'انڈر سیکریٹری' بنا کر ترقیاتی محکمے میں تعینات کر دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ اپنی جانب مہاتما گاندھی کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہوئے۔ مہاتما نے دیہی ترقی کے لیے کئی ایک منصوبے طلب کیے اور ICS نے اس ضمن میں کئی منصوبے تیار کیے۔ ان میں سے ایک منصوبہ عباس خلیلی کے ذہن کی ایجاد تھا۔ یہ کھدر اور اس کی بنائی ہوئی اشیا پر انحصار کرتا تھا جو ایسے چھوٹے چھوٹے دیہی منصوبوں کے لیے تھا جس کے ذریعے انسانی قوت اور کارجوئی (enterprise) کو ترقی دینا مقصود تھا۔ دستکاری کی مصنوعات کو امدادِ باہمی اداروں کے ذریعے بازار میں پھیلایا جانا تھا۔ پیش کی جانے والی تجاویز میں سے خلیلی کی تجویز کو مہاتما نے چنا اور یہ بہت مشہور ہوئی۔ اور یہ شاید پہلا موقع تھا کہ ضلعی سطح سے اوپر ان کی اختراع کی پذیرائی ہوئی اور یہ پورے ہندوستان میں ایک ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئی۔

خلیلی مختلف اضلاع میں تیں برس تک کام کرنے کے بعد دلّی میں تعینات ہو گئے۔ وہاں سے کلکتے اور پھر ۱۹۴۲ء میں صنعت اور تجارت کے ڈائریکٹر بنا کر مدراس بھیج دیے گئے۔ پھر وہ خوش قسمت رہے کہ وہاں ان کو پرکاش، گیری، راج گوپال اچاریہ جیسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے۔

کہا جاتا ہے کہ مدراس میں ان کی تعیناتی کے دوران کارگزاریوں کو آج تک یاد کیا جاتا ہے اور وہاں کے صنعتی اور تجارتی شعبوں میں، بالخصوص دستکاری کی چھوٹی صنعتوں کی ترقی میں جو کردار انھوں ادا کیا تھا اس کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو مدراس کے پولی ٹیک انسٹی ٹیوٹ کے 'باپ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھی کی کوششوں کے باعث وہاں چمڑے کی صنعت اور مچھیروں کی امدادِ باہمی نے بہت کامیابی حاصل کی۔ اور صدی کے ساتویں عشرے تک تامل ناڈو میں ان کی ترقیاتی کوششوں اور ان کی محنت کوشی کو یاد کیا جاتا تھا۔

کلکتے میں ریلوے سیٹلمنٹ کمشنر کی حیثیت میں ان کا ٹریڈ یونینوں کے معاملات سے بھی سابقہ پڑا اور اس سلسلے میں اکثر سیاسی معاملات سے بھی۔ ایک بار ان کے سامنے بہت ہی مشکل مسئلہ آن پڑا تھا۔ انھیں ٹریڈ یونین کے ایک مقدمے میں منصف کے فرائض انجام دینے پڑے، انھوں نے دعوے کو رَد کر دیا پھر بھی ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب ان کے فیصلے کو ٹریڈ یونین والوں ہی کی جانب سے سراہا بھی گیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب ان کی معاملت اور گفتگو اور لوگوں سے منصفانہ طور پر پیش آنے کے ہنر کی پذیرائی ہوئی۔ اس حد تک کہ ایک بہت ہی طاقت ور ہندو ادارے اور 'امرت بازار پتریکا' اخبار نے کلکتے میں عوامی سطح پر ان کی تعریف کی۔

اور اب وہ وقت ہے جب وہ آدمجی اور اصفہانی خاندانوں سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔ اصفہانی خاندان سے تو ان کی شناسائی اس وقت سے تھی جب وہ ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بالخصوص مرزا احمد اصفہانی سے جن کو 'بڑا صاحب' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، ان کی گہری دوستی تھی۔

ضیا خلیلی کو ایک چھوٹا سا دل چسپ واقعہ یاد ہے جو ان کے والد نے بیان کیا تھا۔ یہ واقعہ سول سروس کے کردار کے معیار پر روشنی ڈالتا ہے۔ آدمجی خاندان کے سربراہ نے ایک مخصوص سرکاری افسر کو کسی کام کے ہو جانے پر شکریے کی خاطر اپنے گھر مدعو کیا۔ مگر اس افسر نے دعوت کو رد کر دیا اور کہا کہ وہ ان کے گھر نہیں آ سکے گا۔ آدمجی نے خلیلی صاحب سے شکایت کی اور وہ اس افسر سے ملنے گئے۔ انھوں نے نہایت شائستگی سے افسر کی تادیب کیا اور کہا کہ ملک کے کسی بڑے کاروباری کے گھر ایک پیالی چائے پی لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ افسر نے جواب میں کہا کہ میں نے ان کا کام اپنا فرض سمجھ کر کیا اور یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی جس کے لیے میں شکریے کا مستحق ہوتا۔ خلیلی صاحب نے کہا،

جب تک افسران اپنے اصولوں کی پابندی کرتے رہیں ان کو عام انداز میں زندگی گزارنی چاہیے۔ اس کے بعد ملاقات کا انتظام کیا گیا اور سب کچھ بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا گیا۔ اس واقعے سے ICS افسران کی دیانت داری کا اظہار ہوتا اور یہ بھی کہ ان دنوں کسی کے لیے کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران خلیلی صاحب کو امریکا میں ہندوستان کے اقتصادی کونسلر بنانے کی پیش کش کی گئی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا اس لیے کہ ان دنوں ان کی والدہ بہت علیل تھیں، بلکہ بسترِ مرگ پر تھیں۔ لہٰذا انھوں نے اس وقت تک ہندوستان میں قیام کیا کہ ہندوستان کو آزادی مل جائے تا کہ وہ ہندوستان میں رہنے یا پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

۱۹۴۷ء کا مبارک سال ان کے لیے مشکلات کا زمانہ تھا۔ پاکستان ہجرت کروں یا ہندوستان ہی میں قیام کروں؟ مدراس چھوڑنے کی وجوہات کیا ہوں گی؟ ان کا خاندان رئیس تھا، عزت بھی تھی، وہاں فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہو رہے تھے۔ کچھ ہندو اور مسلمان خاندانوں نے ان کو ہندوستان میں رُکنے کے مشورے دیے مگر دوسروں نے ان کو قائل کر دیا کہ پاکستان کو ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ اپنی جائیداد چھوڑنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا، نہ اس سلسلے میں یہ عنصر ان کے فیصلے کو بدل سکتا تھا۔ عباس خلیلی نے اپنے دوست ،ور مربی گوپال اچاریہ سے مشورے کے لیے رابطہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے لیے اس سے بڑی خوشی کی کوئی اور بات نہ ہوگی کہ وہ ہندوستان ہی میں قیام کریں مگر چوں کہ وہ اس فیصلے کے لیے ان سے مشورہ طلب کر رہے ہیں اس لیے وہ یہی کہیں گے کہ ان کو پاکستان چلے جانا چاہیے اور یوں انھوں نے ان کو اپنی آشیر باد دے دی۔

ضیا نے کہا کہ ''پاپا نے بتایا کہ ان کا ہاضمہ خراب ہو رہا تھا، جو ایک مشکل فیصلے کے دباؤ کہ وجہ سے تھا۔ جاؤں یا نہ جاؤں؟ یہ کسی قسم کے خود کار فیصلے کا معاملہ نہ تھا۔ اس لیے کہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے ان پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ وہ سیاسی، انتظامی اور سماجی مسائل میں رچے بسے تھے۔ ان کے لیے کوئی مشکل نہیں تھی۔ مدراس میں فرقہ ورانہ فسادات بھی نہیں ہو رہے تھے، نہ خلیلی خاندان کے لیے نہ ہی کسی مسلمان طبقے کے لیے کوئی خطرہ تھا۔ یہ لوگ جنوبی ہندوستان کے ایک عزت دار خاندان کے فرد تھے جن سے نہ صرف سب واقف تھے بلکہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ صاف تھے، انھوں نے صاف ستھری تجارت کی اور جو کچھ کمایا وہ صاف ستھرے انداز میں۔ وہ اسمگلر نہیں تھے، کامیاب تاجر تھے اور عملی طور پر پورے ملک میں ان کے تعلقات تھے، تو پھر پاکستان کیوں جائیں؟ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا، اور سب کچھ پیچھے چھوڑ جانے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا، سوائے اس کہ ان کے جذبات بھڑک رہے تھے اس تصور سے کہ بالآخر دنیا میں ایک اسلامی مملکت وجود پا رہی تھی اور اس کی بنیاد میں اپنے حصے کی خدمات پیش کرنا چاہتے تھے، پاکستان کو ایک مستحکم ریاست دیکھنا چاہتے تھے جہاں کروڑوں افراد رہنے والے تھے۔ ان کے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ وہ پاکستان کو مسلمانوں کی شناخت کے طور پر دیکھتے تھے اور ان کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے بیشتر جاننے والے یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ان جیسا انسان صرف اپنے تصور کی تجسیم کے لیے بھلا کیوں سب کچھ تج دینا چاہتا تھا جس کے بچ جانے کے امکانات بہت کم تھے۔

جس وقت یہ فیصلہ کیا جانا تھا عباس خلیلی بڑے دولت مند انسان تھے۔ ان کے والد نے ورثے میں مدراس کی ماؤنٹ روڈ کے تجارتی علاقے میں ایک بہت بڑی عمارت چھوڑی تھی جس میں سو ڈیڑھ سو دکانیں تھیں۔ اس زمانے میں یہ عمارت اندازاً کروڑوں ڈالر کی تھی۔ مگر جب انھوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو ان کے لیے اتنی ساری دولت کو خیر باد کہہ دینا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ انھوں نے اتنی ساری جائیداد اس لیے پیچھے چھوڑ دی کہ ان کے خیال میں یہ محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ نہ انھوں نے اس کو فروخت کرنے کی کوشش کی نہ ہی مختار نامہ وغیرہ لکھا۔ وہ اس خیال میں تھے کہ وہ صرف اپنے پڑوسی ملک جا رہے ہیں، جیسے کہ وہ ایران، برما یا سنگاپور جایا کرتے تھے۔ تو پھر پاکستان کیوں نہیں؟ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن پاکستان اور ہندوستان آمنے سامنے صف آرا ہوں گے۔ جنگ کا تو تصور بھی

نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تمام مسلمانوں کی طرح عباس خلیلی بھی پاکستان کو اپنے وطن کے طور پر دیکھتے تھے جہاں وہ اپنی سہولت کے مطابق آ جا سکتے تھے۔ حتیٰ کہ جناح صاحب نے بھی بمبئی کے مالابار ہل میں واقع اپنا مکان فروخت نہیں کیا تھا، بہ ظاہر اس خیال سے کہ وہ جب چاہیں گے ہندوستان پاکستان کے درمیان سفر کیا کریں گے۔ خلیلی صاحب نے غلام محمد اور چودھری محمد علی سے صرف ایک بات پوچھی تھی کہ کیا پاکستان وہ سرزمین ہوگی جہاں لوگ باعزت طور پر کام کاج کر سکیں گے؟ ان کے مثبت جواب کی بنا پر انھوں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ بہت شروع ہی میں، اگست یا ستمبر کے مہینے میں، پاکستان آ گئے تھے اور فوراً ہی کام شروع کر دیا تھا۔ انھیں اس کمیٹی کا رُکن بنا دیا گیا تھا جسے پاکستان کی معاشی اور صنعتی ترقی کے لیے ہدف متعین کرنے کا مسودہ تیار کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ جو دستاویز تیار کی گئی تھی وہ ان افکار اور خیالات کا مجموعہ تھی جن کی بنا پر ملک کو معاشی اور صنعتی ترقی دی جا سکے، اور اس میں مستقبل میں سرکاری اور ذاتی معاشیات کے بارے میں بنیادی مشورے بھی دیے گئے تھے۔ وزارتِ صنعت کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے ذاتی حیثیت میں بھی بہت قابلِ داد کام کیے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت اعلیٰ فکر کے آدمی تھے اور اس اعتبار سے ان کو یاد رکھا جائے گا۔ پاکستان ہجرت پر انھیں کبھی افسوس نہیں ہوا۔ وہ اپنے اس فعل سے بہت مطمئن اور مسرور تھے، باوجود اس کے دو 'برادر' ملکوں کے درمیان کے حالات کی وجہ سے ان کو بہت بڑی ذاتی قربانیاں دینی پڑی تھیں۔

۱۹۵۲ء میں انھیں ڈائریکٹر جنرل سپلائی اور ڈیویلپمنٹ، اور سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے نو آبادکاری بورڈز کے چیئرمین کی اضافی ذمے داریاں بھی سونپ دی گئی تھیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ان کو انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کمشنر کی حیثیت سے مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا تھا جہاں ان کو صنعتی ترقیات کی رہنمائی کرنی تھی۔ انھیں جلد ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ تیسری دنیا میں کسی بھی قسم کی صنعتی ترقی کے لیے توانائی سب سے اہم ہوگی۔ سو انھوں نے کرنافلی ڈیم کا خیال پیش کیا جس کے بعد توانائی مہیا کرنے والے دوسرے اور تیسرے اسٹیشن کا منصوبہ تیار کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ صرف صنعتی ضروریات ہی کے لیے نہیں، ہر جگہ توانائی موجود ہونی چاہیے۔ لوگوں کو اپنے گھروں، اپنی سلائی کی مشینوں کے لیے بھی توانائی ملنی چاہیے۔ یہ بات وہ بار بار دہراتے تھے اور ان لوگوں سے منوانے میں کامیاب بھی ہوگئے جن کے پاس ایسے فیصلے کرنے کے مکمل اختیارات تھے۔ مشرقی پاکستان میں وہ بہت مقبول تھے۔ وہاں ان کو کئی پرانے دوست مل گئے تھے اور بہت سے نئے دوست بھی بن گئے تھے۔

۱۹۵۴ء میں وہ وزارتِ صنعت کے سیکریٹری کی حیثیت سے کراچی واپس آ گئے۔

میرے بہت پیارے دوست اور مشہور صحافی اردشیر کاؤس جی کے مطابق، ''وہ بہت اچھے دن تھے۔ فضا خوشیوں اور حرکت سے معمور ہوا کرتی تھے۔ صنعت اور تجارت کے شعبے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ ان وزارتوں کے وفاقی سیکریٹریوں کے دفاتر سندھ ہائی کورٹ کی پہلی منزل پر تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اور میرے والد کئی بار ان چار اچھے اور ذہین لوگوں سے ملنے گئے تھے۔ ان میں خلیلی تھے، ان کے دوست کرامت اللہ جو وزارتِ تجارت کے سیکریٹری تھے، اور ان کے معاون سیکریٹری شجاعت عثمان علی اور شیخ محمد یوسف ہوا کرتے تھے۔

اس زمانے میں سرکاری دفتر جانا کتنا مختلف تجربہ ہوتا تھا۔ ہلکے کردار کے پی اے وغیرہ کا وجود نہیں تھا جن کے درمیان سے رینگ کر نکلنا ضروری ہوتا۔ سیکریٹری اور ان کے افسران کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ ''آیئے، آیئے، رُستم اور اردشیر'' خلیلی ہمارا استقبال کرتے ہوئے کہتے۔ ''ہم پر یہ مہربانی آج کیسے ہوئی؟'' (خلیلی ان چند لوگوں میں سے تھے جو میرا نام بالکل اُسی طرح لیتے جیسا کہ ہماری زبان میں لینا چاہیے، ساسانی انداز میں نہ کہ انگریزی انداز میں جو ہمارے فرقے میں عام ہو چکا تھا) عوام سے، وہ جن کے خادم تھے، ان کا اندازِ گفتگو، آج کی افسرِ شاہی کے مقابلے میں، ایسے تھا جیسے سپید کے مقابلے میں سیاہ۔ ہمیشہ لوگوں کے مسائل حل کرنا، ان کی مدد کرنا نہ کہ روڑے اٹکانا جیسا کہ آج کل کے افسران کا شیوہ ہے۔ جہاز رانی کا محکمہ وزارتِ تجارت کے ماتحت تھا مگر ہم ہمیشہ اپنے مسائل سلجھانے کی

غرض سے کرامت سے خلیلی کے دفتر میں ہی ملاقات کرتے۔ اور سب کچھ حل ہو جایا کرتا تھا۔

خلیلی کا تبادلہ وزارتِ آبادکاری اور محنت میں ہوگیا تھا اور اس کے بعد وزارتِ تجارت میں۔ PIDC کی کاغذی کارروائی انھی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور انھوں نے ہی چیئرمین کے لیے غلام فاروق کا نام پیش کیا تھا۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں وہ بہت دل چسپی لیتے تھے اور حبیب رحمت اللہ کو KDA کا چیئرمین انھی نے بنوایا تھا۔ انھوں نے ایک اتنے اہم منصوبے پر ایک غیر سرکاری شخصیت کے تقرر کے حق میں پُر زور دلائل دیے تھے۔

جو بھی ان کی متحرک اور جوشیلی شخصیت سے متعارف ہوتا، اس کو اندازہ ہو جاتا کہ جو کچھ یہ شخص کرتا ہے پورے جوش و جذبے سے، اور وہ صحیح وقت پر صحیح قدم اٹھانے میں یقین رکھتا ہے۔ انھوں نے شبہات کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا، اپنے اطراف خود اعتمادی اور مہارت کا ایک نوری ہالا بنا رکھا تھا جس کی وجہ سے جو بھی ان سے گفتگو کرتا ان ہی کا ہم نوا ہو جاتا۔ ایک ہی وقت میں مختلف النوع منصوبوں کو نمٹانے کا ہنر ان کو خوب آتا تھا اور وہ ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے جو ان کے منصوبوں میں ان کی مدد کر سکیں۔ انھوں نے کبھی مذہب، نسل یا فرقے کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتا۔ وہ ایسے ساتھی چاہتے تھے جو کر گزرنے کے اہل ہوں۔ ضروری نہیں کہ ایسے لوگ صرف آکسفرڈ، کیمبرج یا ہارورڈ، یا کسی اور یونی ورسٹی سے آئیں۔ وہ ہر ایک کو موقع فراہم کرنے پر تیار رہتے تھے۔ ان کا قول تھا ''کام دو اور آزماؤ'' اور ان لوگوں کے لیے جنھیں انھوں نے مدراس میں لیدر انسٹی ٹیوٹ میں ذمے داریاں سونپی تھیں وہ چالیس برس بعد ''بڑا صاحب'' بن گئے تھے۔

ایسے لوگ اپنے ہدف کو حاصل کرنے میں دوستوں کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ عباس خلیلی کو ایسے بہت سے دوست ملے تھے۔ سب بارسوخ، اعلیٰ درجے کے سرکاری افسر، سیاست داں، صنعت کار اور زندگی کے ہر شعبے کے لوگ۔ پاکستان کے ابتدائی زمانے میں ''آڈٹ والے'' ملک پر حکمران تھے۔ غلام محمد، چودھری محمد علی وغیرہ۔ آئی سی ایس افسران ان کے مقابلے میں کمتر سمجھے جاتے تھے۔ مگر عباس خلیلی ایسے معاملات میں کبھی گھبراتے نہیں تھے، وہ ان لوگوں سے دوستیاں گانٹھنے کے راستے نکال لیتے تھے۔ ضیا خلیلی کہتے ہیں کہ ''جب آپ کسی ایسے صوبے میں اقلیت کے فرد کی حیثیت میں کام کر رہے ہوں جہاں آپ کی پوری آبادی بھی اقلیت میں ہو تو آپ کو ان لوگوں سے تعامل کا فن سیکھنا ہوتا ہے۔ آپ کو اکثریتی طبقے سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ چوں کہ مدراس میں ہندو اکثریت میں تھے، وہاں اکثریتی طبقے کے خلاف امتیازی برتاؤ کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہمیں وہاں مسائل کیوں درپیش نہیں ہوئے تھے؟ نہ پنجابیوں اور نہ بنگالیوں کے ساتھ؟ ہمیں سچ مچ کسی سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس لیے کہ ہم انھیں اپنے ہی جیسا سمجھتے تھے، دوستیاں کرتے تھے، ان کو اچھے کارکن سمجھتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ اور ان میں سے اگر ہمیں کوئی پسند نہ آتا، ہم اس سے الگ ہو جاتے۔ درحقیقت ایسے رویے سے آپ ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھ جاتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ 'جیو اور جینے دو' کی ابتدائی تربیت ہی تھی جس کی وجہ سے میرے والد جس کے چاہتے اس کے دوست بن جاتے۔''

صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے کو اکثر 'پرمٹوں اور لائسنسوں'، 'جان پہچان اور رسوخ'، 'اقربا پروری اور حلقہ بندی' کا دور کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں درآمد اور برآمد کے ادارے، تجارتی اور سرمایہ کاری کے بینک حتیٰ کہ انشورنس کمپنیاں بھی صرف مٹھی بھر خاندانوں کے قبضے میں تھیں۔ اور جب خلیلی وزارتِ تجارت میں ہو تو اس کے کارِ منصبی میں سے ایک منصب لائسنسوں کا اجرا ہوگا۔ بڑی نازک اور کرتب والی ذمے داری جس میں ہر طرف سے اثر اندازی اور جانب داری کے لیے دباؤ ہوتا ہوگا۔ ایسے میں ان کا نعرہ تھا 'لائسنس سب کے لیے' اور ان میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اپنے وزیر سے کہہ دیتے تھے کہ ''جناب مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کچھ لوگوں کو خوش کرنا پڑتا ہے، سو آپ مجھے بتا دیں اور میں ان کا خیال رکھوں گا۔ اور اگر آپ اپنے کسی پسندیدہ کو لائسنس دینے کے خواہش مند ہیں تو اس کی بھی نشاندہی کر دیجے، ہم ان کو بھی ناخوش نہیں کریں گے مگر ہماری پالیسی کو تو مت بگاڑیے، ہمیں اپنی پالیسی کو عمل میں تو لانے دیجیے'' دوسرے الفاظ میں یہ ایک حقیقت پسندانہ